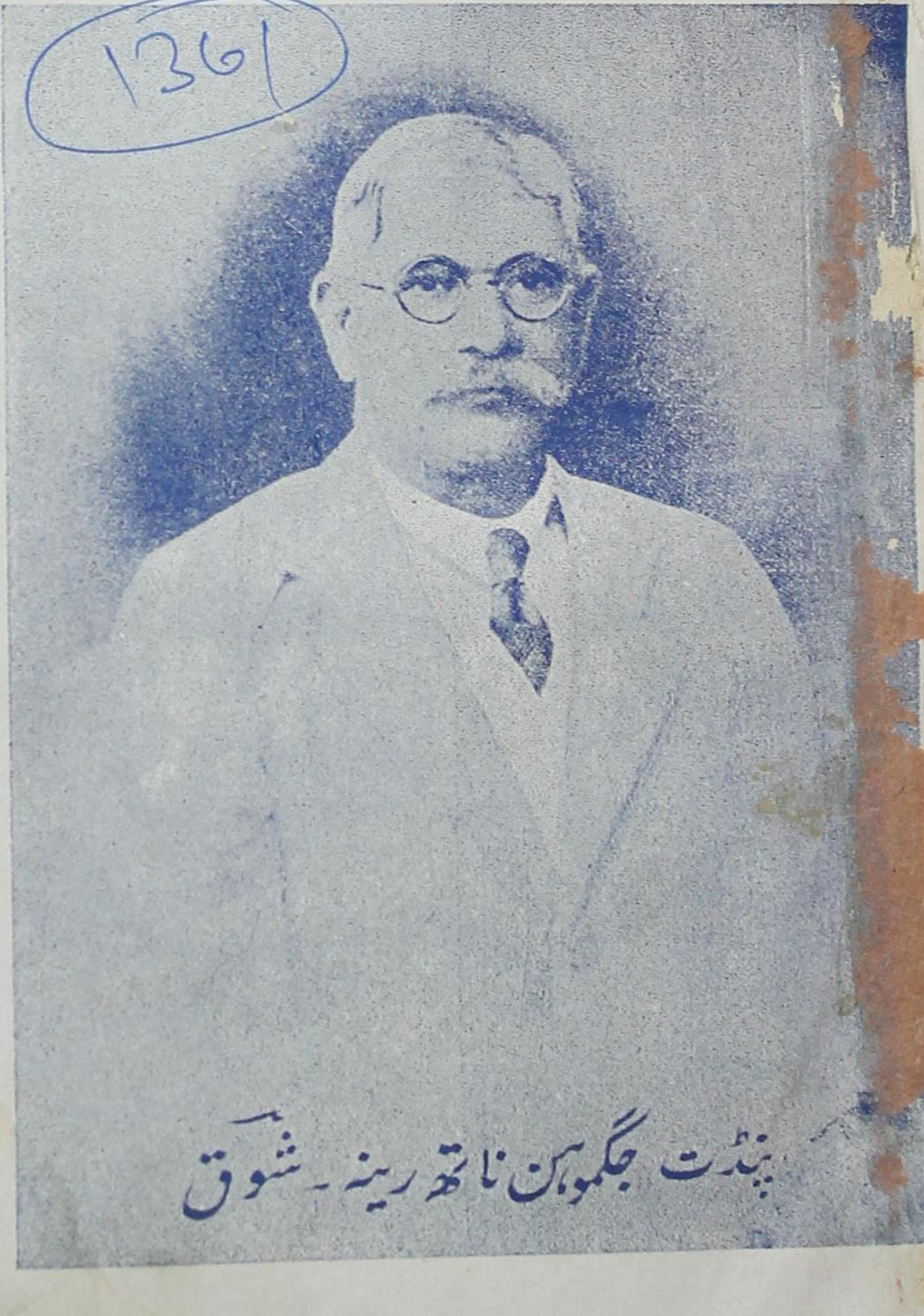
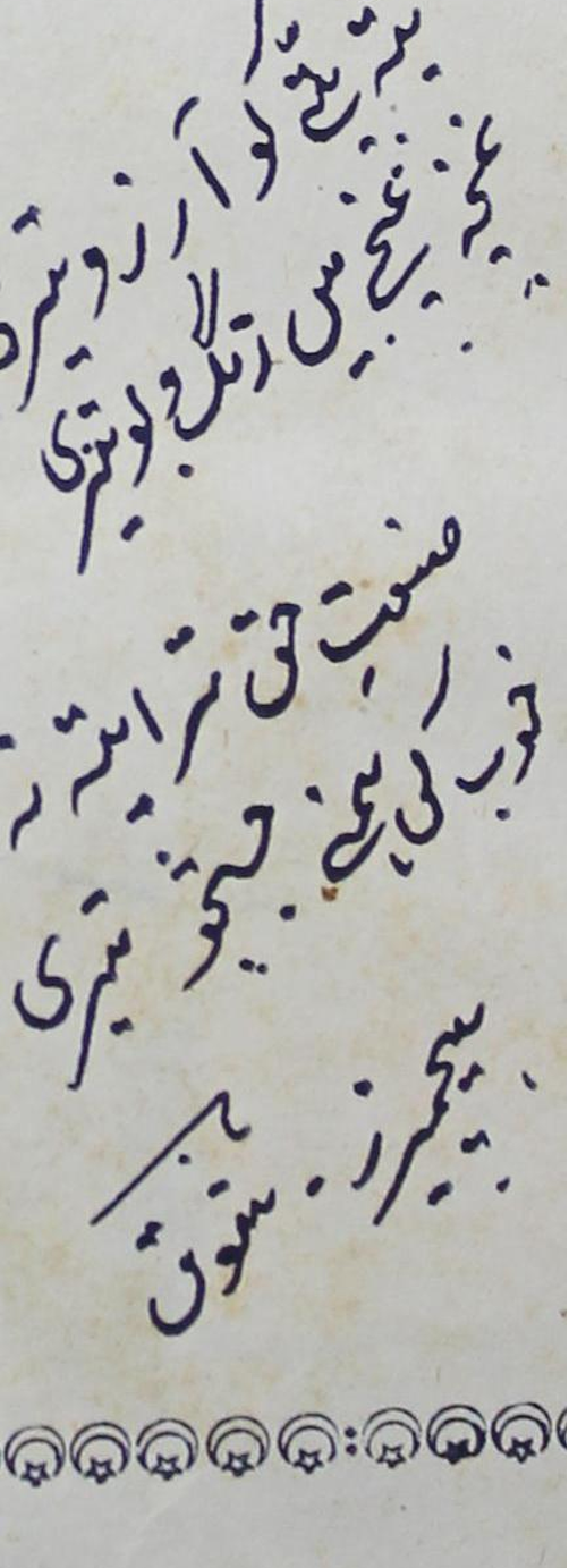


لطف گویائی سے ہے ذوق خموشی بڑھکر   بے زبانی کا مزہ شوق کی تصویر میں ہے



پنڈت جگموہن ناتھ رینہ۔ شوق

عکس خط حضرت "شوق"



پیامِ شوق کا تعارُف

یہ کتاب پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ شوقؔ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

شوقؔ صاحب سے مجھے اِن چند سطور میں تعارف کرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان کے مشہور اہلِ قلم اور اربابِ علم و فضل نے جو پیش لفظ لکھے ہیں وہ ناظرین آیندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ پنڈت منوہر لال زتشی نے خصوصیت کے ساتھ صاحب دیوان کی جو مختصر سوانح عمری درج کردی ہے اُس کو پڑھیں گے۔ میں صرف مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "پیامِ شوق" کے شائقینِ ادبِ اُردو تک پہنچنے کے کیا اسباب ہوئے۔

جنابِ شوقؔ ایک پُرگو اور کہنہ مشق شاعر ہیں اور اکثر مشاعروں میں اونھوں نے شریک ہو کر دادِ سخن حاصل کی ہے۔ اُن کا کلام اخباروں اور ادبی رسالوں کے صفحات کی زینت بھی بنتا رہا ہے لیکن اُنھوں نے سالِ گزشتہ سے پہلے کبھی اپنے کلام کو دیوان کی صورت میں مرتب کرنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔

مجھے سال ہا سال سے پنڈت جی کے ایک ادنیٰ نیاز مند کی حیثیت حاصل رہی

جب آج سے تقریباً چالیس بیالیس برس پہلے وہ شاہجہان پور میں ڈپٹی
کلکٹری کے عہدہ پر مامور تھے اور میں بھی ملازمت کے سلسلہ میں وہیں منسلک تھا
اُسی زمانہ سے وہ مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے میں نے
ملازمت کے سلسلے کو چھوڑ کر اخبار اور پریس کے کام کو ہاتھ میں لیا اور
اِس زمانہ میں بھی رئیہ صاحب سے شعر و سخن کے سلسلے میں اکثر خط و کتابت کا
موقعہ ملا اور ذوالقرنین کے کالم شوق کے کلام سے رونق پاتے رہے
شوق صاحب کو ذوالقرنین میں میری ٹوٹی پھوٹی نظمیں دیکھنے کا موقع
ملتا تھا اور اِس لیے وہ مجھے سچ مچ شاعر سمجھتے تھے حالانکہ میں تغزل سے
ہمیشہ بھاگتا رہا لیکن شوق صاحب اپنی مہربانی سے مشاعروں میں بلاتے
تھے سنہ ۱۹۳۴ء میں جب الہ آباد کا مشہور مشاعرہ ہوا تو مجھے اصرار سے لکھا کہ
آؤ اور غزل پڑھو۔ یہ مشاعرہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۴ء کو منعقد ہوا تھا اور
اِسی تاریخ میں لکھنؤ میں وزیر تعلیم کی صدارت میں صوبہ متحدہ کے مسلمانوں
کی تعلیم کے متعلق سرکاری کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور مجھے اس کی شرکت
ضروری تھی اس لیے میں الہ آباد نہ جا سکا اور غزل بھیجنے پر اکتفا کیا جس کے
مقطع میں جناب شوق کے اصرار کا حوالہ موجود ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ

کون کہتا ہے نظامی نے کیا ترکِ سخن؟
شوق کی خاطر سے آج اُس کو غزل خواں دیکھیے

جناب شوقؔ کے انھیں تعلقات کی بنا پر مجھے آج سے آٹھ دس مہینے پہلے یہ جرأت ہوئی کہ میں اُن سے درخواست کروں کہ وہ اپنے کلام کے جواہر ریزوں کو منسلک کر کے شائقین اردو ادب کے سامنے پیش کر دیں میرے بار بار لکھنے کے بعد اُنھوں نے یہ درخواست اپنے ۴؍ دسمبر ۱۹۳۹ء کے والانامے میں منظور فرمائی اور پھر بھی اپنی منکسر مزاجی سے تحریر فرمایا کہ "میں دنیائے ادب میں ایک گمنام ہستی ہوں اور نہ شاعری کا دعویٰ ہے نہ شہرت کا طالب ہوں۔ دیوان کی صاف شدہ کاپی جلد ارسال خدمت کی جائے گی آپ اُس کو ملاحظہ فرمائیں اور اگر آپ کو اطمینان ہو جائے کہ اس کی طباعت باعث شرمساری نہ ہو گی تو آپ کو اختیار ہے کہ پریس کو دے دیں"

میں نے شروع سے آخر تک مبیضہ میں ایک دفعہ نہیں کئی کئی بار اکثر غزلوں کو پڑھا اور لطف اُٹھایا۔ یوں تو میں نے شوقؔ کا کلام متفرق طور پر اکثر پڑھا اور سُنا تھا مگر اب جبکہ یکجائی صورت میں نظر سے گذرا اور ہر غزل کا سال تصنیف اُس کے ساتھ دیکھا تو یہ اندازہ ہوا کہ شوقؔ کا کلام اس پیرانہ سالی میں بھی جوانی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اُس کو پڑھ کر فارسی کے مشہور شاعر کا یہ مصرعہ زبان پر آجاتا ہے۔

ع کہنہ گشتہ ہمچناں تازہ

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے ۱۸۸۸ء میں آپ نے فرمایا تھا:- ؎

یا تو بے درد ہی اچھا ہوں میں یا اے بیدرد
درد، وہ دے مجھے جس درد کا درماں بھی نہ ہو

اس کے دوسرے سال فرماتے ہیں:-

میں تو خاموش رہوں ہجر میں ڈر ہے لیکن
درد اُٹھ کر کہیں آمادۂ فریاد نہ ہو

اکیاون برس گزرنے کے بعد بھی آپ کے کلام میں یہی درد موجود ہے ۱۹۳۹ء میں فرماتے ہیں کہ ؎

درد اُٹھ اُٹھ کے محبت میں مزا دیتا ہی
دل میں بیٹھا ہوا یہ کون صدا دیتا ہی

یہ سچ ہے کہ انقلابِ زمانہ کا اثر آپ کے کلام پر ہوا ہے۔ مثلاً ابتدائی زمانہ کا ایک شعر ہے ؎

مجھے گر قتل کرتے ہو تو جھگڑا ہی مٹا دینا ۔۔۔ رہے دیکھو نہ اب کی بار پیاری کچھ کسر باقی

اگرچہ نئے کلام میں بجنسہٖ یہ رنگ موجود نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ کے کلام میں امیر مینائی اور منیر شکوہ آبادی کے کلام کے رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے اور اس پختہ کلامی پر خود شوق کا اپنا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

لباس نو بھی پہنا کر ترے دیوانے کو دیکھا
مگر جوشِ جنوں میں چاک دامانی نہیں جاتی

شوقؔ کے کلام کی نسبت اِن چند لفظوں کے کہنے کے بعد مفصل تبصرہ کرنے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ بڑے بڑے نقاد اور مبصروں کے تبصرے ناظرین کے مطالعہ سے گزریں گے اِس لیئے میں صرف یہی کہوں گا کہ شوقؔ کا کلام اِس عمر میں بھی خلوص اور محبت کے جذبات کی آمد سے لبریز ہے اور اس شعر کا مصداق ہے ؎

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہی
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

ہندو شعرائے اُردو کے کلام کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے کلام میں فارسی اور عربی شاعری کی تقلید کی ہے اور اُن تشبیہات لوازمات اور تلمیحات سے کام لیا ہے جو اِسلامی روایات و تمدن کا نتیجہ ہیں اِس نکتہ چینی سے شوقؔ کا کلام بھی نہیں بچ سکتا یہی وجہ ہے کہ "پیام شوق" کے ایک نقاد کو اپنے پیش لفظ کی تمہید میں انھیں خیالات کا اظہار کرنا پڑا اور کیوں نہ کرتے جب کہ جناب شوقؔ پنڈت ہو کر لکھتے ہیں

بت پرستی میں جس کی عمر کٹی
ایسے کافر کا نام اور توبہ

حماقت حضرتِ واعظ کی دیکھو   تقاضائے وضو ہے اور میں ہوں

محشر میں ہے پکار تمہاری اُٹھو چلو
اے سونے والے قبروں کے چھوڑو مزار کو

متاخرین شعرائے اُردو کے زمانہ میں مشاعروں کے موقعہ پر ہندو مسلم شعرا کے باہم اِسی قسم کے مضامین پر چھیڑ چھاڑ باعث تفریح سمجھی جاتی تھی۔ لکھنو میں ناسخ کے زمانہ میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ناسخ نے پنڈت دیا شنکر نسیم کو ایک مصرعہ دیا کہ اس پر مجھ سے گرہ نہیں لگتی۔ آپ طبع آزمائی کیجیے۔ مصرعہ یہ تھا۔

ع "شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا"

نسیم نے فوراً دوسرا مصرع تصنیف کر دیا۔

ع تب تو اِک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

اِس قسم کے خیالات ہر اردو غزل میں خواہ وہ کسی مذہب کے شاعر کے قلم سے کیوں نہ نکلی ہو ملیں گے جس کی وجہ یہہ ہے کہ اردو میں غزل کی ابتدا فارسی غزلوں کی تقلید سے ہوئی لیکن اُس کے یہہ معنی نہیں ہیں کہ غزل کے سوا اردو نظم کے دیگر اصناف۔ نل دمن۔ گیتا، رامائن، مہابھارت کے اذکار سے خالی ہیں۔ یہہ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو شعرا نے اردو نظموں میں جنم اشٹمی۔ سری کرشن لیلا، ہولی کی بہار، کنہیا کا

دھیان، کرشن بھجن۔ شیو راتری۔ گنگا جمنا کے تقدس۔ ہمالیہ کی سربلندی پر اردو نظمیں لکھکر اپنی ادبی شہرت میں چار چاند نہیں لگائے۔ سرور جہاں آبادی۔ طالب کشمیری۔ برق دہلوی وغیرہ کے کلام اسی قسم کی نظموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اردو شعرا سے یہہ بھی شکایت صحیح نہیں ہے کہ وہ گل و بلبل کا رونا روتے ہیں اور کوئل اور پپیہا جیسی چیزوں کا جو اُن کے وطن سے نسبت رکھتی ہیں ذکر نہیں کرتے جس شخص نے منشی شیام موہن لال جگر بریلوی کا مسدس "پپیہا اور پی کہاں" دیکھا ہے وہ اس شکایت کی تصدیق نہیں کرسکتا۔ جگر بریلوی نے اِس مسدس کی ایک ٹیپ میں کیا خوب کہا ہے

تو پپیہے کیا ہے اِک درسِ فنا آموز ہے
'پی کہاں' تیری شرارِ برق ہستی سوز ہے

جگر بریلوی سے بہت پہلے مولانا حالی نے مثنوی "برکھارت" لکھکر یہ بتادیا ہے کہ اردو شعرا اپنے وطن کے ماحول سے بیگانہ نہیں ہیں۔ یہ اردو نظم کے دیگر اصناف کی مثالیں تھیں اب غزلوں میں بھی پپیہے اور کوئل کا ذکر آنے لگا ہے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

کوئلیں کوکیں پپیہے چیخیں! کان کی بات مری غل ٹھہری

جوں جوں مغربی تعلیم کا رنگ اردو نظم پر چڑھتا جاتا ہے۔ تغزل یا

عاشقانہ رنگ پھیکا پڑتا جاتا ہے اب تخییل غالب آرہا ہے۔ لفظی صناعیوں اور مبالغہ آمیزی پر توجہ کم ہوتی جاتی ہے۔ لیکن یہہ نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم طرز کے شعرا کا کلام دل کشی سے خالی ہے یا اُن کی ذہنی کوششوں کا احسان نہیں ہے اُن متاخرین شعرا نے جن کی یادگار جناب شوقؔ اور اُن کے معاصرین آج بھی موجود ہیں اُردو شاعری کے ذریعہ سے زبان میں لوچ اور صفائی پیدا کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے اس لیے نہ صرف ہم بلکہ آیندہ نسلیں بھی اُن کی منت پذیر رہیں گی۔

مجھے اُمید ہے کہ "پیام شوق" اردو نظم کے شایقین کے لیے ایک اچھا تحفہ ثابت ہوگا اور وہ اُس کو پڑھکر لطف اُٹھائیں گے۔

نظامی پریس بدایوں

۳۰ رجون ۱۹۴۲ء

نظامیؔ بدایونی

پیش لفظ

از جناب پنڈت منوہر لال زُتشی صاحب ایم-اے-آئی-ای-ایس
سابق پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ

جناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ صاحب شوق کا مجموعۂ کلام شائع ہو رہا ہے- جناب موصوف نے مجھے حکم دیا کہ تو اس کا پیش لفظ لکھ' میں نے اصلی واقعات بیان کرکے اپنی علمی نا داری اور ادبی گمنامی کی بنا پر بہت کچھ معذرت چاہی- میں جانتا ہوں کہ آج کل اردو کی دُنیا میں ہڑبونگ مچا ہوا ہے' جو بزرگ ہندوستان کی ترقی کے مدعی ہیں اور علم و ادب کے قائد اور علم بردار ہیں اونھوں نے ادب کو اپنی "مدبری" کا خدمت گذار اور شاعری کو اپنی پالیٹکس کی لونڈی بنا رکھا ہے اور اُس سے سوشلزم اور کمیونزم کی اشاعت کا کام لے رہے ہیں اور نظم کے ذریعہ سے کارل مارکس کے نیم برہنہ اکنامک اصولوں کی پکی تلقین منظور رہے اسی گروہ کے ایک ناظم جو حکیم اور فلسفی بھی ہیں فرماتے ہیں:-

مٹے گی مٹیگی یہ سرمایہ داری — گرے گی گرے گی عمارت یہ بھاری

یہ ہو کر رہے گا یہ ہو کر رہیگا

ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو اردو زبان اور اردو لٹریچر کو اسلامی کلچر اور اسلامی پروپگنڈا Propaganda کا آلۂ کار بنا رہا ہے۔ اردو کی خاطر اسی واسطے ہو رہی ہے کہ اِس سے اسلامی خیالات اور اسلامی اثر کے پھیلانے میں مدد ملنے کی اُمید رہے ایسی فضا میں میرا سا بے بضاعت گوشہ نشین کیا لکھنے کی جرات کرسکتا ہے۔ اور لکھے بھی تو اس عہد جواں سالی (the age of youth) کے نرغہ وار شیران بیشہ فصاحت اور سیاست زدہ نہنگان دریائے بلاغت کی نظروں میں اِس تحریر کی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے۔

غالبِ سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آئی

بہ دیارے کہ ندانند نظیری نہ نتیل

اس کے باوجود جناب شوق نے میری عرض و معروض کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا اور مجھے ان کے ارشاد کی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ صاحب خلف پنڈت وشویشور ناتھ رینہ صاحب جولائی ۱۸۶۳ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے آپ کے خاندان کا تعلق جاورہ کی ریاست سے تین پشت سے تھا۔ نواب

غفور خاں مہاراجہ ہلکر کے سپہ سالاروں میں تھے جب اون کو اپنا علاقہ الگ ملا تو اونہوں نے جاورہ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا اور پنڈت جگموہن ناتھ کے جد امجد پنڈت شیو ناتھ صاحب کو دیوان ریاست کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ آپ کے دادا پنڈت ہر نراین صاحب اندور میں ایجنٹ گورنر جنرل سنیٹرل انڈیا کے یہاں ریاست جاورہ کے وکیل تھے اور اُن کے انتقال کے بعد پنڈت جگموہن ناتھ صاحب کے والد کو یہی عہدہ عطا کیا گیا۔ پنڈت جگموہن ناتھ بہ تلاش روزگار شمالی ہندوستان کی طرف تشریف لائے اور ۱۸۹۰ء میں پروبیشنری ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ پنڈت صاحب نے اپنے زمانہ ملازمت میں، صوبجات متحدہ آگرہ واودھ کے بیتر ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹری کی خدمات ہردلعزیزی اور نیکنامی کے ساتھ انجام دیں اور ۱۹۲۰ء میں پنشن، حاصل کی، آج کل آپ شاہجہان پور میں اپنے صاحبزادہ پنڈت چندرموہن ناتھ رینہ صاحب تحصیلدار کے پاس مقیم ہیں۔

جب آپ کو شعر کہنے کا شوق ہوا تو اوائل ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۰ء تک آپ کو اُستاد مسلم الثبوت منشی امیر احمد مینائی سے شرف تلمذ حاصل رہا مگر بدقسمتی سے اُس زمانہ کا بہت سا کلام دیمک کے نذر ہو گیا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۵ء تک ڈپٹی کلکٹری کی مکروہات نے شعروشاعری کی اجازت نہیں دی۔

۱۹۱۶ء میں آپ سید محمد نوح صاحب شہیر مچھلی شہری کے شاگرد ہوئے اور ایک عرصہ تک اپنا کلام اون کو دکھاتے رہے۔ اب اکثر مولوی لیاقت علی صاحب تاباںؔ بدایونی شاگرد منیرؔ سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔

جناب شوقؔ نے اپنی ترتیب کلام میں ایک بہت اچھی بات یہہ کی ہے کہ تصنیف کا سال ہر غزل پر درج کر دیا ہے یہہ بدعت حسنہ اہلِ سخن کی تقلید کے قابل ہے۔ آپ اپنے کلام میں متانت اور اصول فن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور رکاکت اور ابتذال سے پرہیز کرتے ہیں۔ بعض شعرا اپنے سننے والوں کے جذبات اُبھار کر ذرا دیر کے لیے ناشناسوں سے واہ واہ حاصل کر لیتے ہیں مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں:-

بارِ محرم سے پڑی ہی سینۂ نازک میں نیل — اب تری انگیا کا سب آبِ رواں آبی ہوا

چاندنی بن گئی کرتی جو نہا کر پہنی — کاچ کے پھول ہوئے ان کے بدن میں مہتاب

یہہ چوٹی و رزرِ افشاں مانگ سبز اُس پر دو شالہ ہی
تماشا ہی پرطاؤس نے کالے کو پالا ہی

جنابِ شوقؔ کا کلام کنگھی چوٹی انگیا مِسّی کے سوقیانہ مضامین سے پاک ہے اور آپ کے یہاں اس عیاشانہ شاعری کا کوئی ذکر نہیں۔ عوام

میں مقبول بنانے کے لئے آپ نے چھچھورے اور عامیانہ خیال اور بازاری لفظ اور محاورے نظم نہیں کئے ہیں۔ دوسری بات یہہ کہ اصول فن کے ساتھ ساتھ آپ نے سلاست اور صفائی زبان کا لحاظ رکھا ہے اور عربی فارسی کے کرخت اور سنگین الفاظ اور الجھی ہوئی ترکیبوں سے پرہیز کیا ہے اور موشگافی اور خیال بندی کی دھن میں اپنے کلام کو بعید الفہم ترکیبوں اور دور از کار استعاروں سے گرانبار نہیں کیا ہے۔ تناسب لفظی ایک عمدہ صنعت ہے بشرطیکہ اس کا استعمال اعتدال اور سمجھ کے ساتھ کیا جائے اور یہہ نہ معلوم ہو کہ فلاں لفظ خواہ مخواہ شعر میں اس لیے لایا گیا ہے کہ دوسرے لفظ سے مناسبت رکھتا ہے لطف یہہ کہ دونوں لفظ آورد کی پہلوانی کے بغیر اس خوبصورتی سے آئیں کہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہوں اور الگ بھی۔ نسیمؔ لکھنوی نے اکثر اس رنگ کو خوب نباہا ہے ملاحظہ ہو:۔

مجنوں ہو تو اس کی فصد لیجے ۔۔۔ سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجے

سودا ہے مری بکاؤلی کو ۔۔۔ ہے چاہ بشر کی باؤلی کو

مگر یہہ راہ بڑی کٹھن ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا اندیشہ ہو اردو میں ایسے شاعر بھی ہیں جن کے کلام کو اس صنعت کے روگ نے خراب کردیا ہے مثال کے طور پر چند شعر لکھتا ہوں:۔

قبر پر میری لگایا نیم کا اس نے درخت ۔۔۔ بعد مرنے کے مری تو تیر آدھی رہ گئی

باجی ہیں شریفے سب جَرڑ جائیں
بَیری ہیں بیر کیڑے پڑ جائیں

پوست کھینچے اِن رقیبوں کا خدا
جن مرے لالے کو نافرماں کیا

سونا پڑا کنارے نازک بدن اکیلا
دل آم ہو گئے ٹپکا جامن اُسی اُٹھالا

یہہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ جناب شوق نے اس معاملہ میں کافی احتیاط برتی ہے اور صنعت کے پھیر میں پڑ کر اپنے کلام کو مبتذل نہیں ہونے دیا ہے۔ اردو شاعری کے شائق کلام شوق کو پڑھیں اور اس گلستان سخن سے اپنے اپنے مذاق کے مطابق گلدستے تیار کریں۔ میں نے بھی اس چمن کی سیر کی چند تر و تازہ پھول ناظرین کے تفنن طبع کے لیئے حاضر ہیں:-

آنکھوں آنکھوں میں وہ کیا کچھ کہہ گئے
لب پہ آتے ہی گلا جاتا رہا

اک "نہیں" نے بات ساری کاٹ دی
لطفِ عرض مدعا جاتا رہا

جامِ دل بادہ الفت سے بھرا رہتا ہے
واہ کیا ظرف ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

صفحۂ دل میرا آئینۂ رمزِ توحید
رازِ کونین خلاصہ مرے افسانے کا

ناتوانی تجھے اب کوئی کہاں تک روئے
ضعف سے نالۂ بے تاب بھی لرزاں نکلا

اور کیا چاہیئے دیوانے کو اے دستِ جنوں
میرا دامن ہی پھٹا میرا گریباں نکلا

ہماری ناتواں ہاتھوں کی دیکھے کوئی مجبوری
عجب حسرت سے منہ تکتے ہیں داماں گریباں کا

پڑے ہیں مست متوالے نہ کہتے ہیں نہ سنتے ہیں
نئی بستی بنا عالم ہے یہ شہر خموشاں کا

ذرا بیت خانہ ہو کر میں ابھی آتا ہوں اے ساقی
مرے حصّہ کی جو کچھ ہو وہ پیمانے میں رکھ دینا

ازل سے پہلے گر حُسنِ ازل ملتا تو میں کہتا
ذرا سی وحشتِ دل اور دیوانے میں رکھ دینا

دل سے پوچھو کیا ہوا تھا اور کیوں خاموش تھا
آنکھ محو دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش تھا

کیا سمجھ سکتا تھا کوئی تیرے دیوانے کی چپ
جب کسی نے اس سے کچھ پوچھا تو بس خاموش تھا

اک ہمیں کو ساقیا پوچھا نہ تو نے دور میں
ورنہ مے خانے میں تیرے شور نوشا نوش تھا

حریفِ جلوۂ کثرت نہ تھا گو پردۂ وحدت　　فریب حسن سے لازم تھا لیکن باخبر ہونا

نگاہِ مستِ حقیقت تو دیکھی تھی جواب　　مگر یہ دل ہی تھا پھر اس نے ہوشیار کیا
دکھا کے جلوۂ باطل کی اک جھلک اے حسن　　خدا کے بندہ کو ناحق گناہگار کیا

وحدت و کثرت کے جلوے ہیں عیاں دل کے قریب
ضوفشاں ہے نقشِ اصلی نقشِ باطل کے قریب
خاک پروانوں کی تھی اور سوختہ کچھ پر بھی تھے
عبرت افزا اک سماں تھا شمع محفل کے قریب

دکھڑے نہ آج سنیے کسی بے زبان کے ہیں : کچھ ٹکڑے اس کی بھولی ہوئی داستان کے ہیں

ان بتوں میں ہے کمالِ صُنع صورت آفریں　　دیکھ کر اے دل نہیں یادِ خدا پیدا کروں

حدِ احساس گنہ پردہ رحمت میں نہیں　　جو گناہوں میں مزا ہے وہ ندامت میں نہیں

جاگزیں دل میں ہے کب سے جذبۂ حب وطن　　دوستو روز ازل ہی سے میں وفاداروں میں ہوں

ابتدا ہی سے ہی دل مستِ مئے حبِ وطن — انتہائے بیخودی یہ ہے کہ ہشیار وں میں ہوں
بادۂ حبِ وطن مجھ کو پلا دے ساقیا — بن پیئے مدت ہوئی میں تیری بیخواروں میں ہوں

دل کی جاں بازی کا چرچا جا بجا ہونے تو دو
خوگرِ غم حاملِ جور و جفا ہونے تو دو
کس طرح داد ستم لیتا ہوں اُس سے دیکھنا
اس بتِ مغرور کو درد آشنا ہونے تو دو

اٹھا دو پردۂ ظلمت تو اک جلوہ عیاں پھر ہو
کسی کی جستجو ہو اور تلاشِ لامکاں پھر ہو

دل کی بیتابی و حسرت کا کھچا ہو نقشہ — رنگ اُڑتا ہوا تصویر کا بہزاد رہے

صراحی کیوں مرے آتے ہی اے پیرِ مغاں رکھدی
چھپا کر میرے حصے کی بتا تو نے کہاں رکھدی
نہ جانے کیا سمجھ کر میں درِ مسجد تک آیا تھا
یہ کس دھوکے میں میں نے بھی جبیں آکر یہاں رکھدی

انتشارِ دلِ ناشاد الٰہی توبہ — جا بجا رنگ بھی اڑتا ہوا تصویر میں ہے
لطفِ گویائی سے ہی ذوق خموشی بہتر — بے زبانی کا مزہ آپ کی تصویر میں ہے

ہر شے میں ہے نیا نقشا ہر گل میں نیا جلوہ — ان آنکھوں کے کھلنے ہی کیا کیا نظر آتا ہے
نابود نمود ہیں ہیں اے شوق زمانی کی — جو کچھ نظر آتا ہے دھوکا نظر آتا ہے

اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کا تصدق — اندیشۂ کونین سے بیگانہ بنا دے

فنا کی کشمکش درسِ حیات تازہ دیتی ہے
تماشائے شکست موج ساحل دیکھنے والے
تماشائے فریب ہستئ فانی پہ مٹنا کیا
تجھے کیا ہو گیا ہے نقش باطل دیکھنے والے
سحر ہونے سے پہلے ہی نظام عیش کیوں بدلا
تجھے بھی کچھ خبر ہے رنگِ محفل دیکھنے والے

اب کچھ چھوٹی بحروں کا لطف اٹھایئے۔

کر کے قول و قرار کیا کہنا — او فراموش کار کیا کہنا

کام بگڑے تو ہی بناتا ہے
اے مرے کردگار کیا کہنا

دن کو تارے دکھا دیے تو نے
اے شب انتظار کیا کہنا

چار پھولوں کو نہ ترسائیے گا
قبر پر میری اگر آئیے گا

دیجیے مجھ کو نہ گیسو کی قسم
کچھ کہوں گا تو بگڑ جائیے گا

پھر یہ بہکی ہوئی باتیں کیسی
کیا زباں دے کے بدل جائیگا

تماشا ہے ہجوم مدعا کیا
تمنائے دل درد آشنا کیا

خزاں جب آ گئی خوف فنا کیا
چمن میں رہ کے امید بقا کیا

جو وقت آنے کا تھا اس پر نہ آئی
تو اب آ کر کرے گی اے قضا کیا

لب فریاد کا دمساز ہوں میں
اسی انجام کا آغاز ہوں میں

تمنائے نشیمن بے بسی ہیں
شکستہ بال کی پرواز ہوں میں

نیاز و بے نیازی سے مجھے کام
گدائے بارگاہ ناز ہوں میں

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر سید محمد حفیظ - ایم - اے، پی - ایچ - ڈی، ڈی لٹ یونیورسٹی الہ آباد

حضرت شوق اُس زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ شمالی ہند کی زبان میں زمانے نے تفرقہ اندازی نہیں کی تھی۔ ہندو و مسلمان اپنی مشترکہ زبان کی ترقی اور ادب نوازی میں مصروف تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا ہر پڑھے لکھے خاندان میں تھا۔ ہندو اساتذہ فکرِ سخن میں اسی قدر منہمک تھے جس قدر مسلم شعراء زبان اور ادب کی دونوں نے خدمت کی۔ حضرت شوق مرتب "بہارِ کشمیر"، کے اسم گرامی سے اردو دنیا کافی روشناس ہو چکی ہے۔ بیس برس ہوئے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے پنشن لیکر اپنا سارا وقت علمی اور ادبی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ آپ کا مطالعہ وسیع ہے قدیم اساتذہ کا کلام بہت توجہ سے پڑھا ہے۔ شاعری کے فنی نکات سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ احباب اور اعزّا کے اصرار سے اپنے منتشر کلام کو یکجا کر کے ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔ ہر غزل کے سامنے اس کی تصنیف کا سال درج ہے اس سے قاری اندازہ کر سکتا ہے

کہ شوقؔ صاحب نے کون سی غزل کس سال میں کہی، اور اُن کے کلام میں تدریجی ترقی کس درجہ ہوئی۔ کہن سالی کے ساتھ ساتھ کلام میں پختگی بھی آتی گئی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ قدیم اور جدید رنگ کی غزلیں اِس مجموعہ میں موجود ہیں جن کے مطالعہ سے ارباب ذوق لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

حضرتِ شوقؔ نے اپنی غزلوں کو زندہ بنانے کی بڑی کوشش کی ہے ادبی ارتقا کے اصول کے مطابق یہ خوبی اُن کے کلام میں دیر میں پیدا ہوئی ہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری جو بیشتر تقلیدی اور ایک حد تک صوفیانہ ہے۔ اِس بیان کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے۔

عمر کا تقاضہ تو یہی تھا کہ ان کے اِس زمانہ کا کلام زیادہ رنگین اور جوانی کے اُبھرتے ہوئے جذبات اور واردات قلب کا حامل ہوتا۔ شوقؔ صاحب نے اس کمی کو بہت جلد محسوس کیا کہ تصوف کی دنیا نوخیز شاعر کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ کچھ عرصہ تک دیر و حرم کی سیر کرنے کے بعد خود ہی بول اُٹھے ؎

رہا جب مدتوں دیر و حرم میں
سمجھ میں آ گیا بھٹکا گیا ہوں

اس شعر کو شاید کوئی تصوف کا شعر سمجھے لیکن میں اُسے اُن کی شاعری کا ایک نیا دور خیال کرتا ہوں جس کے بعد ان کے اشعار میں تدریجی

ترقی نمایاں ہے بہ ایں معنی کہ وہ دلی کیفیات کے زیادہ حامل ہیں؛ صوفیانہ شاعری کی پامال تلمیحات جس سے اردو شاعری مملو ہے ان کے کلام میں کم ہونے لگیں اب وہ زندگی کے راز کو سمجھنے کے لیئے زیادہ کوشاں نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ قدیم ماحول کا اثر ان پر زیادہ غالب ہے اس لیے وہ قدیم فارسی اور اردو شعرا کی روش سے زیادہ آگے اس دنیا میں نظر نہ ڈال سکے۔

سب پوچھتے ہیں شہر خموشاں میں کون ہے
حیراں ہیں کیا بتائیں مسافر کہاں کے ہیں

یہ خیال ان کی ذہنی دیانت داری پر مبنی ہے۔ زندگی کی گتھی کو سلجھانا انسان کا کام نہیں اور نہ کسی شاعر کا فرض ہے؛ وہ تو جو کچھ سمجھے بیٹھا ہے اس خیال کے ردِّ عمل اور تاثرات کو اپنے اشعار میں رو کرتا ہے۔ شوق صاحب نے اپنی ذہنی راستبازی کا ثبوت اس شعر میں دیا ہے ؎

آئے تھے روتے ہوئے ہم عالم ایجاد میں
واقفِ رازِ نہاں تھے صرف گویائی نہ تھی

زندگی اس قدر المناک بن گئی ہے کہ ہر شخص اس معاملہ میں متشکک ہو گیا ہے کہ آیا زندگی کا راز محض آلام و مصائب کا جھیلنا ہی ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ شوق صاحب نے اس شک پر اثبات کی مہر لگا دی ہے

اور یہی ان کا نظریہ ہے :-

شوقؔ صاحب کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا کلام بہت زیادہ سلیس اور سادہ ہے وہ استعاروں اور تشبیہات کو بلا ضرورت نباہنے کی سعی نہیں کرتے - اس سے اپنے کلام کو لفظی نمائش سے پاک رکھتے ہیں اور نہ ہر دم اس فکر میں رہتے ہیں کہ شاعرانہ تخیل میں لامحالہ ایک اُپج پیدا کی جائے -

اکثر اوقات وہ پُرانی غزلوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں باوجود اس کے اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں -

غالبؔ کی مشہور غزل پر ؏ سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں آپ نے بھی چند شعر لکھے ہیں جن میں سے دو شعر پیش کرتا ہوں - ان سے آپ کے کمال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے - ملاحظہ ہو ؎

وہ اُمیدیں جن سے وابستہ تھا لطف زندگی واے نادانی جنوں میں نذر حرماں ہو گئیں

ہم نے مانا تھا کہ رونا عاشقوں کا کھیل ہے

آنسوؤں کی چند بوندیں موجِ طوفاں ہو گئیں

غالبؔ کی غزل کے بعد ایسے اشعار پیدا کرنا آسان کام نہیں - یہ شوقؔ صاحب کے فکر سخن کے کمال کا بیّن ثبوت ہے - ان کی انفرادیت جیساکہ ان کی حال کی غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے ترقی پذیر ہے اور یہ سب

زیادہ قابلِ داد امر یہ ہے کہ اس پیرانہ سالی میں جس طرح سے مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ زبان میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے ویسے ہی ان کی غزلوں میں ایک چاشنی اور دلاویزی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:۔

اسی کو انتہائے عشق کیا اے شوقؔ کہتے ہیں
کہ مجھ کو خود نہیں معلوم کیا ہے آرزو میری

دلِ رمیدہ کو وہ گمرہی معاذ اللہ
نشانِ جادۂ منزل دکھا دیا میں نے

کسی کا جلوۂ نازِ جب نظر آیا
سرِ نیاز وہیں پر جھکا دیا میں نے

نسیمِ صبح کو شکوا ہی میرے نالوں سے
خموش غنچوں کو کیوں گدگدا دیا میں نے

موخر الذکر دو شعر اپنی نوعیت کے لحاظ سے شوقؔ صاحب کے دیوان میں یکتا ہیں۔ تخیئل اور جذبات کی حدیں مل کر شاعرانہ ترنم اختیار کر لیتی ہیں اور اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ ان کی شاعری میں مزید ترقی ہونیوالی ہے۔

بعض اوقات شوقؔ صاحب نے ایسے شعر نکالے ہیں جو معنویت اور حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے خوب اور نہایت خوب ہیں۔

مندرجۂ ذیل اشعار کا لطف وہ زیادہ اٹھا سکتا ہے جس کو انسان کے نفسیاتی تحلیل سے کچھ دلچسپی ہو۔ فرماتے ہیں:۔

دل اگر ہو مطمئن تو پھر کوئی مشکل نہیں
دور ہو جاتی ہے الجھن خود سلجھ جانے کے بعد

اضطرابِ دل کی حالت ہمنشیں مجھ سے نہ پوچھ
اک نیا افسانہ چھڑ جاتا ہے افسانہ کے بعد

حضرت شوق کے کلام میں موسیقی اور رنگینی کی مثالیں دیکھنی ہوں تو ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کچھ باقی ہے آنکھوں میں سرورِ مئے رنگیں
تو چاہے تو ساقی انھیں مے خانہ بنا دے

وہ کون سی صورت تھی کیا تجھ سے کہیں لے دل
جس رخ سے اُسے دیکھا تصویر نظر آئی

یہ چند متفرق اشعار میں نے مشتے نمونہ از خروارے پیش کیے ہیں۔ ان سے اُن کی شاعری کا اندازہ اجمالی طور پر کیا جا سکتا ہے شوق صاحب نے جو کچھ بھی شاعری میں کمال حاصل کیا ہے وہ اُن کی عدیم الفرصتی اور پیرانہ سالی کا لحاظ رکھتے ہوئے یقیناً قابل تحسین و تعریف ہے۔ امید ہے کہ اردو شاعری کے سخن فہم اور قدرداں حضرات اُن کے کلام کا مطالعہ کر کے مستفیض ہوں گے

۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء (ڈاکٹر) محمد حفیظ سید

ام۔ اے۔ پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
یونیورسٹی، الہ آباد

ترجمہ

پیش لفظ از پنڈت امرناتھ جھا صاحب ایم۔ اے

وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوقؔ

اکثر ہندو صاحبان قدیم ہندو روایات کے ماحول کے تربیت یافتہ اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے پیرو اردو لکھا کرتے تھے اور اس کے ادب میں جو ظاہری اعتبار سے غیر ملکی لٹریچر کا دھندلا نقش تھا مگر حقیقت میں اپنی ساری روحانیت عرب و فارس ہی سے حاصل کرتا تھا معقول استعداد بہم پہونچاتے تھے۔ صدہا ہندو خصوصاً کشمیری۔ کھتری۔ کایستھ صاحبان۔ شہروں کے رہنے والے اور حکومت کی مشین کے پرزے۔ غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ حتیٰ کہ مرثیہ کی تصنیف میں شب و روز منہمک رہتے تھے۔ باوجود اس کے ان میں سے ایک بھی مسلمہ اُستاد کا پایہ حاصل نہ کرسکا۔ آج بھی اردو لٹریچر کی

تاریخ میں کسی ہندو کا نام اردو کے مسلّمہ بانیان کی فہرست میں نہیں ملتا ہے نسیم، چکبست، یا سرشار، کے کلام کی تعریف میں بادلِ ناخواستہ کسی کی زبان سے ایک آدھ لفظ نکل گیا تو وہ کسی شمار میں نہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ ڈھائی سو برس کی طویل مدت اور دوسرے درجہ کے شعرا کی صف میں صرف تین نام!

حقیقت یہ ہے کہ اردو کو کبھی ہندوستانی فطرت سے لگاؤ نہیں رہا وہ ہندی ذہنیت کے لیئے بدیسی ہی رہی۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہندو کس بیباکی سے اپنے آپ کو کافر اور اپنے معبودوں کو بُت کے الفاظ سے خطاب کرتا ہے۔ یہم لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یوسف زلیخا، کی تلمیحات سے کام لیتا ہے نل دمن، ساوتری سیتا و ان کا نام زبان پر نہیں لاتا۔ خدا سے مخاطب ہوتا ہے۔ عیسیٰ موسیٰ کا تذکرہ کرتا ہے۔ منصور و انا الحق کو یاد کرتا ہے۔ مگر وہ نام جن سے گہوارہ طفولیت ہی سے اس کے کان آشنا ہیں اس کی زبان پر نہیں آتے۔ تعجب ہے کہ اردو کا ہندو شاعر اردو زبان کی تشبیہات و لوازمات یعنی میکشی۔ توبہ۔ میکدہ۔ گل و بلبل گورستان۔ محشر۔ جلوۂ طور وغیرہ میں جو اس کے لیے بالکل بدیسی ہیں کس درجہ جذب ہو جاتا ہے۔ اور خود اپنے ملک کی روایات یعنی شہد کی مکھیوں۔ کنول۔ کوکا بیلی۔ کوئل پپیہا۔ آم کی مور اور برکھا رت کے بے شمار محسوسات سے کس درجہ نابلد نظر آتا ہے۔

غور و خوض کے بعد میں اس رائے پر پہونچتا ہوں کہ ہندوؤں کا بیشتر اردو کا کلام ادب سے نہیں بلکہ عجائبات ادب سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی شاعر کو ایسی زبان میں جس کی تخلیق اس کی فطرت سے مغائرت رکھتی ہو رفعت حاصل نہیں ہوا کرتی۔ ماہرین کلام کے اکثر نام جو زبان پر آ سکتے ہیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہندو اردو اس طرح نہیں لکھتے بولتے کہ وہ ان کی مادری زبان کہی جا سکے اور بلند پایہ ہندو کو بھی زبان اور محاورات کے آخری فیصلے کے لیے ایک مسلم سے اپیل کرنا پڑتی ہے۔

ہندو شعرا کا اردو کا کلام خواہ وہ مسلم استاد کی رہنمائی کے ماتحت ظہور میں آیا ہو۔ آورد کی حیثیت رکھتا ہے۔ بایں ہمہ بہت سے ہندو حضرات ہیں جنہوں نے اردو کے بدیسی ضوابط و عروض میں جو دیس کے اپنے عروض سے بالکل غیر مشابہ بلکہ غیر مانوس ہے اور جس میں غیر مذہبی روایات شامل ہیں معقول مہارت حاصل کی۔ یہ حضرات واقعی قابل ستایش ہیں۔

پنڈت جگموہن ناتھ رینہ جی کشمیری برہمن ہیں۔ دوسرے کشمیری برہمنوں کی طرح ان کا خاندان بھی مسلمانوں کے دربار عدالت سے جہاں فارسی زبان کا رواج تھا وابستہ تھا۔ پنڈت جی کی تربیت ایسے بدیسی ماحول میں ہوئی جو ملک میں رائج ہو گیا تھا۔ پس انھوں نے اردو کو اپنے ادبی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جس طرح اکثر نوجوان جو اینگلو انڈین

تعلیمی فضا میں تربیت پاتے ہیں انگریزی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

رینہ صاحب نے امیر مینائی کا رنگ اختیار کیا۔ امیر مینائی لکھنو کی شاعری کے زوال کے زمانہ کے نمایندہ کہے جاتے ہیں۔ مبالغہ۔ زنانہ پن۔ تصنع۔ تکلف۔ تشبیہات۔ لفاظی۔ ظاہری چمک دمک۔ خیالات کی پستی رعایت لفظی اس زمانہ کی خصوصیات ہیں۔ زور کلام۔ تازگی۔ طراوت نئے نئے خیالات و تجربات کو اردو کے جامہ میں لانا جو متقدمین کی خصوصیات تھیں اس دور میں مفقود ہیں۔ نوجوان رینہ کی طبیعت پر امیر مینائی کا رنگ چڑھ گیا۔ اور ان کا دائرہ تخیل ان کے اثرات سے محدود ہو گیا۔ ان اثرات نے ان کے کلام میں زبان کی صحت وصفائی پیدا کی۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی ترتیب میں رینہ صاحب جس احتیاط سے کام لیتے ہیں اس سے آج بھی ظاہر ہے کہ امیر مینائی کا اثر کس درجہ اپنا کام کئے ہوئے تھا۔ ابتدائی طرز رفتہ رفتہ اور بعد کے کلام میں ان کی شخصیت صاف نمایاں ہے۔

مسٹر رینہ کی شاعرانہ زندگی کی ابتدا ۱۸۸۵ء میں ہوئی اب ۱۹۴۰ء میں بھی سلسلۂ کلام جاری ہے اس پچاس سالہ مدت میں طرز میں تغیر وتبدل ہونا خیالات اور عقائد میں پختگی کا پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے مگر سارے کلام میں ایک رنگ چھایا ہوا ہے کچھ مسائل رینہ صاحب کے دماغ میں جاگزیں ہیں اور ان کی وجہ سے بہترین نظمیں ظہور میں آئی ہیں۔ غور کرنے

سے معلوم ہو گا کہ ابتدائی کلام میں اوسط درجہ کے خیالات اور خوشنما مگر کم درجہ کا تصنع پایا جاتا ہے یہ ہی امیر مینائی کے دور کی خصوصیات ہیں:-

(۱) مجھے گر قتل کرتے ہو تو جھگڑا ہی مٹا دینا
رہے دیکھو نہ اب کی بار پیارے کچھ کسر باقی

(۲) لاکھ تم روٹھو مناؤنگے نہ ہم بھی ہرگز تم ہمیں جان گئے، ہم تمھیں پہچان گئے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو لکھنؤ کے آخری طرز میں لکھا گیا ہے۔

گرایا بتوں نے بھی نظروں سے دل کو نہ رکھا کہیں اب لگانے کے قابل

ایک اور دوسرا شعر ملاحظہ ہو

تمھاری ادائیں سلامت رہیں قضا کو قضا آگئی آگئی

۱۸۹۰ء میں بھی زمانہ حال کا رنگ موجود ہے۔

ہے سفر دور کا اور ساتھ میں ہمدم بھی نہیں
تجھ سا اے شوق کوئی بے سر و ساماں بھی نہو

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ریختہ کی زبان میں مینائی کا رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ بعض اشعار میں ترکیب کی صفائی اور محاورات کے با محل استعمال نے لطف پیدا کر دیا ہے۔

(۱) پڑے ہیں مست متوالے نہ کہتے ہیں نہ سنتے ہیں
نئی بستی نیا عالم ہے یہ شہر خموشاں کا

(۲) خدائی کا ہے دعویٰ اِن بتوں کو دیکھئے کیا ہو
اُدھر بھی ایک سجدہ آؤ پھر امتحاں کریں

(۳) کجا بت خانہ و کعبہ کجا خمخانہ و ساقی
کہاں سے شوقِ دید لایا ہے کہاں مجھکو

(۴) رفتہ رفتہ تا درِ جاناں بیٹھتے اُٹھتے یوں پہنچے
ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے صبح سے تا شام چلے

(۵) خوں شدہ دل کو جلاتے ہیں جلانے والے
آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

(۶) یاس و حرمان و تمنا حسرت و رنج و الم
شوق سے سُنیئے کہ سب مجھے دل کے افسانے ہیں

(۷) کس قدر دلچسپ تھی رودادِ شوق
سارے عالم میں کہاوت ہو گئی

پامال مضامین کا استعمال بالکل قدرتی امر ہے۔ کوئی غزل گو اس سے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ غزل کا تنگ میدان عروض کے ضوابط سے محدود ہے ہر شعر میں ردیف قافیہ کی قید لازمی طور سے ان تشبیہات اور تخیلات کی طرف مائل کرتی ہے جن کے لیے الفاظ مخصوص ہوتے ہیں۔ جب شاعر جذبات عشق اور الفاظ عقیدت، قیامت، شکایت، حکایت۔ عبادت کثرت طبیعت کا پابند ٹھیرا تو اس کے لیئے جدت طرازی اور پرواز خیال کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے اِس لیے شاعر کے ساتھ بلا تامل ہمدردی کرنا پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ باوجود اِن دشواریوں کے غزل آج بھی ویسی ہی دل آویز اور سدا بہار ہے۔ مسٹر رتینہ نے پُرانے مضامین بکثرت لیئے ہیں اور پھر بھی وہ

اپنے کلام کو دلکش بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دیر کو آؤ چلیں اک ٹھکانا ہے وہی
مل ہی جائیگا وہیں کوئی تو رہبر اپنا (۱)

شعلۂ شمع نے اُٹھ اُٹھ کے جلایا آخر
شوق پہ حشر ہوا بزم میں پروانے کا (۲)

آئے ہیں تیرے سنتے ہوئی میخانہ میں ساقی
بھر دے تو ہی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہمارا (۳)

بتکدہ چھوڑتے نہ چھوڑ دیا
اب ٹھکانا نظر نہیں آتا (۴)

ہم ڈھونڈتے گئے تو صنم خانہ مل گیا
تجھ کو تلاش سے بھی نہ واعظ خدا ملا (۵)

کیسا بتخانہ کہاں کا دیر کیسی خانقاہ
جس جگہ سجدہ کیا ہم نے وہ کعبہ ہوگیا (۶)

گزرا جو کوہ طور پہ معلوم ہو وہ سب
شائق ہوں پھر بھی جلوہ برق جمال کا (۷)

مے دیکھتے ہی شیشے میں للچا کے پی گیا
زاہد بھی ترک مے کی قسم کھا کے پی گیا (۸)

جو تجھکو کہنا ہو کہدے وہ سب اشاروں میں
سمجھ میں کچھ نہیں آتی تری زباں صیاد (۹)

ذرا جی بھر کے اُس کو دیکھ لینا ہیں دم آخر
نظر آتا قفس سے کاش اپنا آشیاں مجھکو (۱۰)

اُن کی بزم ناز میں روئی اگر
شمع محفل سے نکالی جائے گی (۱۱)

بنایا سجدہ گاہِ حسن ہم نے دیر و کعبہ کو
وہی جلوہ ہے دونوں جا ادھر آ دیکھنے والے (۱۲)

کسی کا جلوہ گہِ ناز جب نظر آیا
سر نیاز وہیں پر جھکا دیا ہم نے (۱۳)

رہ رہ کے پوچھتے ہیں یہی باغباں سے ہم
لے جائیں چار تنکے کہاں آشیاں سے ہم (۱۴)

جو حضرات مسٹر ربنہ سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ وہ کس درجہ ذہین اور زندہ دل واقع ہوئے ہیں مسٹر ربنہ نے زندگی کا پورا لطف

اُٹھالیا اور اُن کا سفر زندگی خوشگوار رہا۔ اب آپ کی عمر کا وہ زمانہ ہے کہ وہ ہنسیں مسکرائیں اور تفریح کریں ان کے کلام میں ظرافت کا رنگ ہے مگر ان کی ظرافت وہ ظرافت نہیں ہے جو کلفت سے بچنے کے لیئے اختیار کی جاتی ہے بلکہ وہ ظرافت ہے جس کی نظر زندگی کے روشن پہلو پر پڑتی ہے۔

(۱) وہ دورِ بادۂ رنگین وہ دلفریب نظر — خدا ہی ہے جو بچے پاکباز رہنی دے

(۲) جاتے کعبہ میں بت پرستی کو — یہ بھی اک فرض تھا ادا کرتے

(۳) بتکدہ چھوڑنے والے تو نہ تھے — خیر ملتی ہے تو جنت ہی سہی

(۴) بت پرستی میں جس کی عمر کٹی — ایسے کافر کا نام ارے توبہ

(۵) حشر میں ہم بھی زبان کھولیں گے — بے کسوں کی وہاں شنوائی ہو

(۶) خود ہوئے آکر اسیر دامِ عشق — دشمن جاں قوت پرواز ہے

مسٹر رینہ کے کلام کے مطالعہ کرنے والے محسوس کرتے ہیں کہ باوجود ظاہری صیقل کے اِس زندہ دلی اور ظرافت کی تہ میں جس سے ان کے ملنے والے اثر لیئے بغیر نہیں رہ سکتے ان کی ہندو مذہبیت نمایاں ہے اور ان کے فلسفہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کا فلسفہ اور پرماتما کا تصوّر ان کو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے اور کوئی فلسفی بھی اس کے اثر سے باہر نہیں ہوتا۔ وہ فلسفہ کیا ہے یہ کہ ایک حیات کے بعد دوسری حیات نصیب ہوگی یا ممات و گمنامی۔ یہ قافلہ یونہی چلتا رہیگا یا اس کی کوئی منزلِ مقصود ہے جہاں سب کو قیام کرنا ہوگا۔ طویل

کلفت کے بعد راحت میسر ہوگی یا نہ ہوگی۔ رہنما کون ہے وہ راستہ سے آگاہ بھی ہے یا نہیں۔ راستہ ایک ہی ہے یا ایک سے زیادہ۔ کیا ہمارے پیش روندگان کے نقشِ پا ہماری امداد کرتے ہیں۔ زندگی کے مصائب و آلام، دنیا کی افسوں گری سے بچنے کی کوشش، یہ ہیں وہ مسائل جو رتینہ صاحب کے کلام کا ماحصل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی شاعری کا خلاصہ،۔ یہ ہے اُن کے تخیلات کا تخیل، اُن کی لفاظی کا عطر:۔

(۱) راحتِ زیست یہی درد کا حاصل ہے یہی
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

(۲) نقشِ ہستی مٹا رہا ہے کوئی
پر مٹاتا نظر نہیں آتا

(۳) ڈھونڈنے پر بھی نشاں ملتا نہیں
مرقدوں کی شانِ غربت دیکھنا

(۴) بتائیں کیا کہ آئے ہیں کہاں سے ہم کہاں ہو کر
نشاں اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر کا بے نشاں ہو کر

(۵) سب پوچھتے ہیں شہرِ خموشاں میں کون ہو
حیراں ہیں کیا بتائیں مسافر کہاں کے ہیں

(۶) نہ پوچھو ہم صفیرانِ چمن میں کون ہوں کیا ہوں
غرض جو کچھ ہوں اک سازِ شکستہ کی صدا میں ہوں

(۷) رہا جب مدتوں دیر و حرم میں
سمجھ آئی کہ بہکا یا گیا ہوں

(۸) ملکِ عدم کو قافلے جاتے ہیں رات دن
ظاہر مگر کسی کے نشانِ قدم نہیں

(۹) آئے ہیں کس مقام سے جاتے ہیں دیکھیے کدھر
کس نے کیا ہے اب طلب اس کی بھی کچھ خبر نہیں

(۱۰) رستہ تو اُدھر کا پوچھ لیتے اے ملکِ عدم کے جانے والو

(۱۱) اِسی کو انتہائے عشق کیا اے شوقؔ کہتے ہیں
کہ مجھ کو خود نہیں معلوم کیا ہے آرزو میری

(۱۲) اپنی ہی خبر نہیں ہے ہم کو بے کار کسی کی جستجو ہے

(۱۳) علاج دردِ جگر چارہ ساز رہنے دے ذرا اسی میں ہے سوز و گداز رہنے دے

(۱۴) یہ کسے معلوم منزل تک وہ پہنچے یا نہیں جا بجا ہم تو نشان رفتگاں دیکھا کیے

(۱۵) نہ پوچھے کوئی یہ ہم سے ملے گا کیا ہمیں اس میں
کہ نقشِ ہستی کو خود ہم مٹائے جاتے ہیں

(۱۶) جسے ہو دیکھنا آئے وہ دیکھ لے منظر حیات و موت کے جھگڑے چکائے جاتے ہیں

(۱۷) بچھڑے ہیں کب سے قافلۂ رفتگاں سے ہم
مل جائیں گے کبھی نہ کبھی کارواں سے ہم

(۱۸) پتہ کس سے پوچھیں کہ منزل کہاں ہے کہاں تک مسافر بھٹکتا رہے گا

(۱۹) کچھ بتاتے ہی نہیں شہر خموشاں والے کیوں پسند اُن کو یہ اُجڑا عدم آباد آیا

(۲۰) اب اُس کی جستجو کیا ہے نہ جانے وہ کہاں پہنچا
نشانِ کارواں منزل بہ منزل دیکھنے والے

جو اشعار میں نے منتخب کئے ہیں اُن سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر رینہ کے اِس دیوان میں شاعری کا کتنا خزانہ موجود ہے۔ مسٹر رینہ کا کلام شاہد ہے کہ ان کو الفاظ پر کس درجہ قابو اور اُردو شاعری کے مواد پر کتنی دسترس حاصل ہے اُنھوں نے شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ سوز و گداز راز زندگی کی فکر ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کے کلام کا پایہ قدیم طرز کے لکھنے والے معاصرین میں بلند کرتی ہیں۔ میں اِس مختصر تنقید کو ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ ؎

عمر آخر ہوئی وہ جوشِ جوانی نہ رہا
یاد آیا بھی تو کس وقت خدا یاد آیا

فہرست غزلیات

ردیف الف

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۱	روح کا پیکر خاکی سے جدا ہو جانا	۱
۲	دل سے درد لا دوا جاتا رہا	۲
۳	کہہ تو دو مجھ سے کیا بھلا جانا	۲
۴	لایئے بھی مجھے دے دیجئے خنجر اپنا	۳
۵	حجاب دیر و کعبہ پردہ دل سے اوٹھا دینا	۳
۶	آفریں صد آفریں جو کچھ کیا اچھا کیا	۴
۷	تمھارا گھر تھا تمھیں اوس کو کیا مٹانا تھا	۴
۸	لامکاں نام ہے اُجڑے ہوئے ویرانے کا	۵
۹	عشق دل سا نہ کوئی بے سر و ساماں نکلا	۵

نمبر	غزل	صفحہ
۱۰	قاتل ہے نرالا کوئی مستانہ ہمارا	۶
۱۱	سواد شام غربت یا نشاں ہے داغ ہجراں کا	۷
۱۲	اشکوں میں صاف خونِ جگر ہے ملا ہوا	۸
۱۳	ساقیا جام سنا لیں میرا جام جسم ہوا	۹
۱۴	میں ہی کیا درد طلب سارا زمانہ ہوگا	۹
۱۵	دہانِ زخم پر خنجر نہ تڑپانے میں رکھ دینا	۱۰
۱۶	دل میں آئی ہے ستمگار یہ کیا۔	۱۱
۱۷	دل ہی واقف ہے جو کچھ آخر مآل دل ہوا	۱۱
۱۸	لیکن نہ فیصلہ ستم ایجاد سے ہوا۔	۱۲
۱۹	مگر کچھ ہچکیوں کا خود لب اظہار ہو جانا	۱۳
۲۰	او فراموش کار کیا کہنا	۱۳
۲۱	دل چرانا نظر نہیں آتا۔	۱۴
۲۲	کبھی خدا کا نہ دم بھر بھی شرمسار رہا۔	۱۵
۲۳	عشق میں کیا دل رہی یاس دحرماں ہو گیا	۱۵

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۲۴	کہیں آنا نہ جانا زائرِ بتخانہ ہو جانا	۱۶
۲۵	نیچی نظروں نے کیا او پشیماں کیا کیا	۱۷
۲۶	عجب حسرت کا عالم تھا ہجومِ یاس و حرماں تھا	۱۷
۲۷	آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بس ہوش تھا	۱۸
۲۸	کون سی وہ شمع تھی دل جس کا پروانہ ہوا	۱۹
۲۹	دیکھنا دل مرا آئینہ عرفاں ہو گا۔	۱۹
۳۰	مبارک شوق دل کو مائلِ دردِ جگر ہونا	۲۰
۳۱	اپنا ہمدرد کبھی عالمِ امکاں نہ ہوا۔	۲۱
۳۲	ہم کو رسوائے زمانہ شوقِ منزل نے کیا۔	۲۱
۳۳	وہ بھی بالیں سے بدگماں اُٹھا	۲۲
۳۴	تجھے نا آشنا بے مہر اور بیداد گر جانا	۲۳
۳۵	سب کچھ ملا جو موقع عذر خطا ملا۔	۲۴
۳۶	چار پھولوں کو نہ ترسائے گا۔	۲۴
۳۷	ستا کر ستمکش کو کیا پائے گا۔	۲۵

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۳۸	کس کو پروا ہی کہ وہ کشتۂ حرماں نہ رہا	۲۶
۳۹	دل کی دھڑکن کیا گئی اب دل کو سودا ہو گیا۔	۲۶
۴۰	تماشائے ہجومِ مدعا کیا	۲۷
۴۱	مے دیکھتے ہی شیشہ میں للچا کے پی گیا۔	۲۸
۴۲	اپنی الفت دیکھنا میری محبت دیکھنا	۲۸
۴۳	اللہ رے نصیب دلِ پر ملال کا	۲۹
۴۴	خوگرِ جور و جفا تا حد امکاں کر دیا۔	۳۰
۴۵	وفا شعار کو تو نے ذلیل و خوار کیا	۳۰
۴۶	پیشِ نگاہ پردۂ محمل نہیں رہا۔	۳۱
۴۷	غفلت کو میری پردہ حائل نہ سمجھا۔	۳۲
۴۸	لائے نہ رنگ تازہ داغوں کا پھر ابھرنا	۳۲
۴۹	بانئ ظلم و ستم پر سر بیداد آیا۔	۳۳
۵۰	جھلک تھی جلوہ کی لیکن وہ بے حجاب نہ تھا۔	۳۴
۵۱	دنیا سے بیخودی تھی کیا جانے میں کہاں تھا	۳۴

صفحہ	غزل	نمبر شمار
۳۵	جو پردہ پیش نظر تھا اوٹھا کے دیکھ لیا	۵۲
	(ب)	۵۳
۳۶	وحدت وکثرت کے جلوے ہیں عیاں دل کے قریب	۵۴
	(د)	۵۵
۳۷	سناؤں گا جو قفس میں کھلی زباں صیاد	۵۶
	(ر)	
۳۸	آتش دل اور بھڑکی بزمِ جاناں دیکھکر	۵۷
۳۹	پار ہوجائیں جگر سے ترے پیکاں کیونکر	۵۸
۳۹	ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے ایک ساغر پر	۵۹
۴۰	جگر کو رات بھر روتے کٹی ہے قلب سوزاں پر	۶۰
۴۱	چلو آنسو بہانا بیٹھکر عاشق کے مدفن پر	۶۱

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۶۲	نشاں اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر کل بے نشاں ہو کر	۴۱
۶۳	رہا سینہ میں پنہاں ہمدم درد جگر ہو کر	۴۲
۶۴	چلا ہے شوق بت خانہ کو مرد با خدا ہو کر	۴۲
	ض	
۶۵	نام وفا تو مٹ گیا تیری بلا کو کیا غرض	۴۳
	ک	
۶۶	ہمیں دھوکے میں رکھے گا غبار کارواں کب تک	۴۴
	ل	
۶۷	ادائیں ہیں سب دل لبھانے کے قابل ۔	۴۵
	م	
۶۸	مل جائیں گے کبھی نہ کبھی کارواں سے ہم	۴۵
	ن	
۶۹	دہان زخم اے قاتل مگر فریاد کرتے ہیں	۴۶
۷۰	چشم دل وا ہے مگر اُن کو بلا سکتے نہیں	۴۷

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۷۱	دیدے ساقی مجھے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں	۴۸
۷۲	کس کا ہو کر یہ رہے گا دلِ بیمار کہاں	۴۸
۷۳	اور بدمست نہ ہو چشم فسوں ساز کہیں	۴۹
۷۴	سفاک کے ہے شوق سمایا ہوا سر میں	۵۰
۷۵	بیرخی دل سے یہ کیوں تیر قضا کرتے ہیں۔	۵۰
۷۶		۵۱
۷۷	کچھ اور رنگ لائے نہ درد جگر کہیں۔	۵۲
۷۸	دل ہے اُن کا غبار ہم بھی ہیں	۵۳
۷۹	رحم اُس پر چاہیئے جو جور کے قابل نہیں	۵۴
۸۰	مے نوش دور ہیں لب ساغر سے کیا کہیں	۵۴
۸۱	عشق کی جب سوزشیں بڑھ بڑھ کے پنہاں ہو گئیں	۵۵
۸۲	آتش حسن بھی نہاں جلوہ بے نیاز ہیں	۵۶
۸۲	دکھڑے یہ آج سنیئے کسی بے زباں کے ہیں	۵۶
	محبت میں ستم دیدہ ہوں پامال جفا میں ہوں	۵۷

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۸۵	جامِ وحدت کا ابھی تک کوئی سرشار نہیں	۵۷
۸۶	میں صد ہا بھیس میں آیا گیا ہوں	۵۸
۸۷	کچھ بھی ہو بھولی ہوئی یاد خدا پیدا کروں	۵۹
۸۸	درد بھی اب نہیں رہا نالۂ دلفگار میں	۵۹
۸۹	پھر درد عشق موت بھی آئے تو غم نہیں۔	۶۰
۹۰	کچھ غرض اس سے نہیں کون جفا کرتے ہیں۔	۶۱
۹۱	دل میں ہے کون جلوہ گر دل کو مگر خبر نہیں	۶۱
۹۲	حد احساس گنہ پردہ رحمت میں نہیں۔	۶۲
۹۳	قابل ذکر جنوں عشق کی روداد نہیں۔	۶۳
۹۴	الفت حب وطن سے تو گرفتاروں میں ہوں	۶۴
۹۵	لب فریاد کا دمساز ہوں میں۔	۶۴
۹۶	فریب خوردہ نیرنگ روزگار ہوں میں	۶۵
۹۷	آنکھوں سے پوچھتا ہوں تیری رہ گزر کو میں	۶۶
۹۸	ہے اک ہجوم کیا اس دل بے قرار میں	۶۶

صفحہ	غزل	نمبر شمار
۶۷	اجازت ہو تو مڑ کر سوئے گلشن اک فغاں کر لیں	۹۹
۶۸	حریم ناز کہاں اور سر باز کہاں	۱۰۰
۶۸	آج گردش میں جو وہ نرگس مخمور نہیں۔	۱۰۱
۶۹	نقابِ رُخ کو سب اک پردۂ زیبا سمجھتے ہیں	۱۰۲
۷۰	آستاں وہ کونسا ہے اب جہاں سجدہ کریں	۱۰۳
۷۰	ساقیا کیسی یہ مے ہے کوئی مدہوش نہیں۔	۱۰۴
۷۱	دل اَب یہہ کہہ رہا ہے کہ دردِ نہاں نہیں۔	۱۰۵
۷۱	مبتدائے عشق وہ جس کی خبر کچھ بھی نہیں	۱۰۶
۷۲	یہ کس کی جستجو ہے اور میں ہوں۔	۱۰۷
۷۳	نقاب رُخ الٹ دی ہم نے شوق دید جاناں میں	۱۰۸
۷۳	دل میں ہے شوق کہ میں عشق کا دیوانہ بنوں	۱۰۹
		۱۱۰
۷۴	جلوۂ خاموش دیکھے پیکر تصویر میں۔	۱۱۱
۷۵	جو مر مٹے ہیں وہی پھر مٹائے جاتے ہیں۔	۱۱۲

نمبر شمار	غزل	صفحہ
	و	
۱۱۶	خدارا تیکھی چتون سے نہ اے رشکِ قمر دیکھو	۷۵
۱۱۷	دورِ بادہ بھی نہ ہو سیرِ گلستاں بھی نہ ہو۔	۷۵
۱۱۸	نوگرفتارِ محبت کبھی آزاد نہ ہو۔	۷۶
۱۱۹	لبِ فریاد وا کیوں ہو سرِ شور و فغاں کیوں ہو	۷۷
۱۲۰	چھوڑتے دیوانہ کب ہیں حلقۂ زنجیر کو	۷۷
۱۲۱	دل ہے دیوانہ تمھارا دیکھ لو۔	۷۷
۱۲۲	ہو شرمِ گنہ تو منھ چھپا لو۔	۷۸
۲۳	ستا لو جس قدر چاہو مجال اُف کہاں مجھ کو	۷۹
۱۲۴	ہم کو وہ درد چاہیے جس کی دوا نہ ہو۔	۷۹
۱۲۵	ہاں اِسی پہلو ہیں کچھ دل کا بھلا ہونے تو دو۔	۸۰

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۱۲۶	کیا روک لیتے گریۂ بے اختیار کو	۸۱
۱۲۷	جو مستغنی ہو عالم سے تو عرض مدعا کیوں ہو	۸۱
۱۲۸		
۱۲۹	پس پس کے کفِ پا کے لیے رنگِ حنا ہو۔	۸۲
۱۳۰	دلِ پُر داغ میں باقی رکھا لگھائے حرماں کو	۸۲
۱۳۱	خلش پیدا ہو وہ دل میں وہی دردِ نہاں پھر ہو۔	۸۳
۱۳۲	ادھر آؤ ذرا اندازِ قاتل دیکھتے جاؤ۔	۸۳
۱۳۳	وحشت دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا مجھکو	۸۴
۱۳۴	دل میں اگر نہ عشق و محبت کی چاہ ہو	۸۵
۱۳۵	فرقت میں کیا سکون دل ناصبور ہو	۸۵
۱۳۶	شرم آلود کہیں دیدہ غماز نہ ہو	۸۶
۱۳۷	تلاش جلوہ دلکش میں سرگرم تماشا ہو	۸۶
۱۳۸	سمجھتے ہیں خط ساغر کو جو تحریر مے خانہ	۸۷

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۱۳۹	یاد ساقی و جام ادے توبہ	۸۸
	ے	
۱۴۰	میرے دل میں اک آگ بھڑکا گئی	۸۹
۱۴۱	دل کو میرے رو برو سمجھایئے	۹۰
۱۴۲	دل جو ٹھہرا تو وفا یاد آئی۔	۹۰
۱۴۳	زمانہ ہو گیا دل کو مٹے مٹائے ہوئے	۹۱
۱۴۴	دیکھنا حشر میں کیسی مری رو داد رہے۔	۹۱
۱۴۵	حوصلے پورے ہوئے کیا ترے بیگانوں کے	۹۲
۱۴۶	کیا تری چشم فسوں گر دل پہ للچائی نہ تھی	۹۲
۱۴۷	لہو برسے لہو برسے ہمارے دیدہ تر سے۔	۹۳
۱۴۸	رہ رہ کے یہ دل پوچھتا ہے تیر نظر سے۔	۹۳
۱۴۹	کس بلا کی شوخ چشمی دیدۂ پرفن میں ہے۔	۹۴
۱۵۰	خوناب جگر پی پی کر دیتے ہیں دعا بیٹھے۔	۹۴
۱۵۱	پیش خدا بھی نہ ہم ترک آرزو کرتے۔	۹۵

نمبر شمار	غزل	نمبر صفحہ
۱۵۲	مت پوچھیے کہ کیا دلِ سائل میں رہ گئی ۔	۹۵
۱۵۳	بس بس ستم نہ ڈھائیے لگاوٹ نگاہ کی	۹۶
۱۵۴	علاج تشنہ کامی خاک ہوگا آبِ زمزم سے	۹۷
۱۵۵	بتا تو اے ظالم ستمگر کہ مرنے والے کی کیا خطا ہے ۔	۹۷
۱۵۶	ساقی یہ تیرے جام سے سرشار کون ہے ۔	۹۸
۱۵۷	صراحی کیوں مرے آتے ہی اے پیرِ مغاں رکھدی	۹۹
۱۵۸	افسردگی میں کس کی تمنا کرے کوئی	۹۹
۱۵۹	دیکھئے مرغنئ غذا کیا ہے ۔	۱۰۰
۱۶۰	شام سے تا سحر نہیں آتی	۱۰۱
۱۶۱	وہ جا رہے ہیں مجھ پہ یہ احساں کئے ہوئے ۔	۱۰۱
۱۶۲	کہاں سے لائیں اثر آہ ناتواں کے لیے ۔	۱۰۲
۱۶۳	دل کا کچھ رنگ دگرگوں نظر آتا ہے مجھے ۔	۱۰۲
۱۶۴	کچھ تو ہو درد کی لذت ہی سہی ۔	۱۰۳
۱۶۵	دھواں منہ سے دیکھو نکلتے ہوئے ۔	۱۰۴

نمبر شمار	غزل	نمبر صفحہ
۱۶۶	یہ بھی اُفتادِ ناگہانی تھی	۱۰۵
۱۶۷	دوا کیا کرتے دردِ لا دوا کی	۱۰۵
۱۶۸	بھلا ہو تمھارا صدا کر چلے ۔	۱۰۶
۱۶۹	دیکھ لی ہم نے بیرخی دِل کی	۱۰۶
۱۷۰	وہ شوخی بھی شرم و حیا ہو گئی	۱۰۷
۱۷۱	ہر غنچہ و گل میں تری بو ہے ۔	۱۰۸
۱۷۲	دل کہاں تھا جو ہم فدا کرتے ۔	۱۰۸
۱۷۳	دھنواں اُٹھتا ہے جام و ساغر سے	۱۰۹
۱۷۴	دَم میں خنجر کی روانی دیکھ لی	۱۱۰
۱۷۵	لوٹ آئے جلوہ گاہِ یار سے	۱۱۰
۱۷۶	کچھ نہ پوچھو جو مزہ شوخیٔ تقریر میں ہے ۔	۱۱۱
۱۷۷	کیا کہیں کہہ نہیں سکتے یہ جفا کس کی ہے ۔	۱۱۲
۱۷۸	خیر رہے میخانے کی ساقی دورِ جام چلے ۔	۱۱۲
۱۷۹	عجب لذت دِلِ اندوہگیں معلوم ہوتی ہے ۔	۱۱۳

صفحہ	غزل	نمبر شمار
۱۱۳	آپ لے جائیں اُسے باتوں میں بہلاتے ہوئے	۱۸۰
۱۱۴	نیا زمانہ میں اک اِنقلاب ہو جائے۔	۱۸۱
۱۱۵	اَرماں حصول سب دلِ مضطر کے ہو گئے	۱۸۲
۱۱۵	دل کی جس دم غستہ حالی جائے گی	۱۸۳
۱۱۶	جسم میں ہے روح زندانی بری	۱۸۴
۱۱۶	یہ زندگی دو روزہ بھی ہے قضا کے لیئے	۱۸۵
۱۱۷	ساقیا ہوش ربا نرگس مخمور رہے	۱۸۶
۱۱۸	میں ہوں بیٹھا پاؤں توڑے اور منزل دور ہے۔	۱۸۷
۱۱۸	اپنے دیوانوں کو کچھ ہشیار رہنے دیجئے۔	۱۸۸
۱۱۹	کئی خالی ابھی قاتل کے نمکداں ہوں گے	۱۸۹
۱۱۹	ترے دیوانوں کو تھی جستجو قیدِ سلاسل کی	۱۹۰
۱۲۰	وقتِ آخر دید کی حسرت نہ بسمل میں رہے۔	۱۹۱
۱۲۱	پھر درد دل کو بہر تماشا اُٹھائیے۔	۱۹۲
۱۲۱	سحر کب دیکھیئے اَے نالۂ شبگیر ہوتی ہے۔	۱۹۳

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۱۹۴	عجب کیا ہے مرا قاتل بھی بہر امتحاں آئے	۱۲۲
۱۹۵	کونسا جلوہ ہی جس کا یہ تماشائی ہے	۱۲۲
۱۹۶	مزاج یار نازک ہے ابھی فریاد رہنے دے۔	۱۲۳
۱۹۷	ساقی کے ایک جام سے سرشار ہو گئے	۱۲۳
۱۹۸	ہم لگی دِل کی ہیں اشکوں سے بجھانے والے۔	۱۲۴
۱۹۹	سوزشِ دِل پہ کبھی رحم نہ کھائے کوئی۔	۱۲۵
۲۰۰	وہ تیغِ دودم ترے لبوں پر ہے ادھر بھی	۱۲۵
۲۰۱	سبزہ و گل چمن دہر میں بیگانہ ہے۔	۱۲۶
۲۰۲	یہ بزم ساقی و پیر مغاں رہے نہ رہے۔	۱۲۶
۲۰۳	کیا خاک راس آئے کسی کی دوا مجھے	۱۲۷
۲۰۴	دور میں ساغر رہے معمور پیمانہ رہے۔	۱۲۷
۲۰۵	نہ گیا جوشِ جنوں کم کبھی وحشت نہ ہوئی	۱۲۸
۲۰۶	سچ بتا دو تمھیں کیا اہلِ جفا ملتا ہے۔	۱۲۹
۲۰۷	ہر شے میں مجھے تیرا جلوہ نظر آتا ہے۔	۱۲۹

صفحہ	غزل	نمبر شمار
۱۳۰	دیدۂ حسرت سے گردِ کارواں دیکھا کئے	۲۰۸
"	پہلو میں میرے دل ہے کوئی جامِ جم نہیں ہے	۲۰۹
۱۳۱	ہو نہ جائے اے جنوں اگلا سا وہ سودا مجھے	۲۱۰
۱۳۱	دونوں عالم کو بھلا بیٹھے دیوانوں نے	۲۱۱
۱۳۲	وہ الجھن کیوں نہیں ہوتی وہ کاوش کیوں نہیں ہوتی	۲۱۲
۱۳۳	مقدر سے ہمیں پھر گردشِ پیمانہ مل جائے۔	۲۱۳
۱۳۳	محوِ حیرت ہے ابھی سے آرے دیکھا کیا ہے۔	۲۱۴
۱۳۴	کیا دکھایا ہے سماں جلوۂ یکتائی نے	۲۱۵
۱۳۵	کھینچ لائی حسن تیری جلوہ آرائی مجھے	۲۱۶
۱۳۵	پھرتا ہوں اک ہجومِ تمنا لیئے ہوئے۔	۲۱۷
۱۳۶	دلِ ایذا طلب تیری نئی دنیا میں حالت ہے۔	۲۱۸
۱۳۶	علاجِ دردِ جگر چارہ ساز رہنے دے۔	۲۱۹
۱۳۷	اے جلوۂ رسوا مجھے دیوانہ بنا دے	۲۲۰
۱۳۸	کیا کرے چھیڑ کے افسانہ ہجراں کوئی	۲۲۱

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۲۲۲	مرے ناز و نیازِ عشق میں اک راز پنہاں ہے۔	۱۳۸
۲۲۳	جستجوئے یار گر کرتے تو کچھ مشکل نہ تھی۔	۱۴۰
۲۲۴	الٰہی کیسا یہ سوزِ دل ہے کہ جس میں مطلق اثر نہیں ہے۔	۱۴۰
۲۲۵	مشکل ہر ایک سہل ہے دشوار کے لیئے	۱۴۱
۲۲۶	الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے ٹوٹے ہوئے دل کی	۱۴۲
۲۲۷	پر رکاوٹ سی رکاوٹ خنجر قاتل میں ہے۔	۱۴۲
۲۲۸	کہاں ہیں آ کے دیکھیں رقص بسمل دیکھنے والے	۱۴۳
۲۲۹	آج حسن ناپشیماں کو پشیماں کیجیئے۔	۱۴۴
۲۳۰	ڈھونڈتی ہے کس لیئے اب کاہش منزل مجھے۔	۱۴۴
۲۳۱	سوزِ سودائے محبت دل کے پیمانہ میں ہے۔	۱۴۵
۲۳۲	آتشِ عشق بلا آگ لگائے نہ بنے	۱۴۶
۲۳۳	درد فرقت کی کہانی اور ہے۔	۱۴۶
۲۳۴	ساقی کی صرف چشم مراعات چاہیئے	۱۴۷
۲۳۵	وہ ہو علاج درد مداوا کہیں جسے۔	۱۴۸

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۲۳۶	حسن کہتا ہے مجھے کچھ اور عریاں دیکھیے۔	۱۴۸
۲۳۷	کہانی کیا سنائیں داغ ہائے سوزِ ہجراں کی	۱۴۹
۲۳۸	بھٹی کی کھنچی شراب پی لی	۱۵۰
۲۳۹	دل نے کیا خاک جستجو کی	۱۵۰
۲۴۰	زبانِ ہر کس و ناکس پہ ہے اب داستاں میری۔	۱۵۱
۲۴۱	نظر کو گلشن عالم میں اک حیرت سی حیرت ہے۔	۱۳۹
۲۴۲	سمجھا نہیں اب تک کوئی کیا رازِ بقا ہے۔	۱۵۲
۲۴۳	دیکھیں ویرانہ جلوہ خانہ بنے یا نہ بنے	۱۵۲
۲۴۴	شکوہ نہ جور کا ہے نہ کچھ عرضِ حال ہے۔	۱۵۳
۲۴۵	کیا ہوگا جستجو سے آنکھوں میں وہ نہاں ہے۔	۱۵۳
۲۴۶	ہے عناصر پہ قرارِ زندگی۔	۱۵۴
۲۴۷	ختم جس جا عقل کی پرواز ہے۔	۱۵۵
۲۴۸	نہیں دھوکے میں آتے طرزِ دنیا دیکھنے والے	۱۵۵
۲۴۹	عجب محفل تھی ہر اک بے خبر تھا سعئ حاصل سے۔	۱۵۶

نمبر شمار	غزل	صفحہ
۲۵۰	کوئی تدبیر ایسی ہو شکستہ ساز بن جائے۔	۱۵۸
۲۵۱	وہ ہے اور شہرت یکتائی ہے۔	۱۵۸
۲۵۲	یہ خبر نہیں کہ قسمت مجھے لائی ہے کہاں سے	۱۵۹
۲۵۳	کسی اسیر بلا کی یونہی بسر ہو جائے۔	۱۵۹
۲۵۴	ہم نے مآلِ عشق پر ڈالی نظر نہ تھی۔	۱۶۰
۲۵۵	امنگوں پر شباب آئے نہ آئے۔	۱۶۰
۲۵۶	مرے دل نے بھری محفل میں کھو دی آبرو میری۔	۱۶۱
۲۵۷	سوزشِ دل کے لیے کیا قسمتِ پروانہ ہے	۱۶۲
۲۵۸	ازل سے عشق کو درس بقا دیا میں نے۔	۱۶۲
۳۵۹	کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے۔	۱۶۳
۳۶۰	حسن جب چشمِ سخن گو کا پتہ دیتا ہے۔	۱۶۵
۲۶۱	ظلمت کدۂ دل میں تنویر نظر آئی۔	۱۶۷

اوم

ردیف الف

سنہ ۱۹۲۶ء

روح کا پیکرِ خاکی سے جدا ہو جانا — وقت سے پہلے ہی ہستی کا فنا ہو جانا

حاصلِ زیست ہے الفت میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بے نیازِ ستم و جور و جفا ہو جانا — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

جلوۂ سنگِ حرم ہو کہ صنم خانۂ عشق — چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

راحتِ زیست یہی عشق کا حاصل ہے یہی — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

خشک آنسو نہ ہوئے ہجر میں روتے گزری — خاک ثابت ہوا پانی کا ہوا ہو جانا

مدعا سے ہو مرے جبکہ خبردار اثر — تو بھی اے حسنِ طلب دستِ دعا ہو جانا

دل میں اس شرط سے اے درد جگہ دیتا ہوں — اب پہلو سے مرے اٹھ کے جدا ہو جانا

صدمۂ جور و جفا کی نہیں پروا ہمدم — چاہیئے بندۂ اربابِ وفا ہو جانا

عبرت انگیز تماشا ہے دمِ بازپسیں
شوقؔ حسرت کا گلے مل کے جدا ہو جانا

سنہ ۱۹۱۷ء

دل سے دردِ لا دوا جاتا رہا
غم بھی کھانے کا مزہ جاتا رہا

اب نہ ہمدم ہے نہ مونس ہجر میں
درد بھی دل سے اُٹھا جاتا رہا

آنکھوں آنکھوں میں وہ کیا کچھ کر گئے
لب پہ آتے ہی گلا جاتا رہا

اک نہیں سے بات ساری کاٹ دی
لطفِ عرضِ مدعا جاتا رہا

دل گیا پہلو سے پھر کیا رہ گیا!
پوچھتے کیا ہو کہ کیا جاتا رہا

جیب و دامن کا سہارا اب کہاں
خود گریباں ہی ہرا جاتا رہا

اِن بتوں کی ناز برداری میں شوقؔ
دل سے سب خوفِ خدا جاتا رہا

سنہ ۱۹۱۷ء

کہہ تو دو مجھ سے کیا بھلا جانا
کیا کہا میں نے تم نے کیا جانا

میری سیدھی سی بات پر اُن کو
اُلٹی سیدھی مجھے سُنا جانا

تم مری آرزو کو کیا سمجھے
تم نے کیا میرا مدعا جانا

آہ کھینچی تو وہ بھی رُک رُک کر
آپ نے اس کو بھی گلا جانا

ایک تیرِ نظر بھی ہے کوئی چیز
چلتے پھرتے اِدھر لگا جانا

میری اس میں بھی کچھ بھلائی تھی
تم نے مجھ کو اگر بُرا جانا

شوق تم بھی کہاں بھٹکے
نہ ابھی جادۂ رضا جانا

سنہ ۱۹۱۷ء

لائیے بھی مجھے دیدیجیے خنجر اپنا
دوں جگہ اس کو کلیجے میں سمجھ کر اپنا
آپ سنتے ہی نہیں خیر نہ سنیئے دل کی
ہم بھی رکھتے ہیں مگر داور محشر اپنا
دیر کو آؤ چلیں ایک ٹھکانہ ہی وہی
مل ہی جائے گا وہیں کوئی تو رہبر اپنا
لکھ دیا کاتب تقدیر نے کیا جانیے کیا
دیکھیں گے جو دکھائے گا مقدر اپنا
شوق دیوانہ ہی مجذوب ہی سودائی ہی
حال دل کیجیے سنا ہو اُسے اکثر اپنا

سنہ ۱۹۱۸ء

حجاب دیر و کعبہ پردۂ دل سے اُٹھا دینا
ذرا بڑھ کر جمالِ یار آئینہ دکھا دینا
کہیں بیکاں نہ ان کے راہ میں آتے ہوئے بھٹکیں
ٹھکانا درد دل اُٹھ کر ذرا تو ہی بتا دینا
تجھے بھی دیدۂ تر ہجر میں رونے کی کیا سوجھی
یہ اشک انمول موتی ہیں انکو یوں بہا دینا
اُسے تو لو لگی ہو رات دن خود دیدہ بازی کی
کہیں کیا دیدۂ تر سے لگی دل کی بجھا دینا
خمار آلودہ آنکھوں کا میں متوالا ہوں اے ساقی
کبھی تو جام و ساغر جوش مستی میں اُٹھا دینا
دلِ گم گشتہ رہ رہ کر ہمیں تو یاد آتا ہے
کہاں ڈھونڈیں کدھر جائیں جہاں ہو خود صدا دینا

غضب ہی شیشۂ دل کو گرایا شوق ظالم نے
اُٹھا لو دا ورِ محشر کو یے جا کر دکھا دینا

۱۹۱۸ء

آفریں صد آفریں جو کچھ کیا اچھا کیا — اِک دِل شوریدہ دے کر عشق کا بندہ کیا
ضبط کیونکر ہو سکے آہ و فغانِ دردِ دل — کیا کہوں ہیں اضطرابِ شوق نے کیا کیا کیا
بھر کے دم اُلفت کا کھویا خود بخود صبر و قرار — دل کی بتیانی نے حسن و عشق کا سودا کیا
چشم گریاں تو ہماری اشک ہی پیتی رہیں — رنگِ رُخ نے اُڑ کے رازِ عاشقی افشا کیا
عشق پر ناحق لگا ہی الزام اُس کا کیا قصور — تیرے حسنِ خود نما نے خود تجھے رُسوا کیا
کر کے ضبطِ آہ چپکا سامنے بیٹھا رہا — اور وہ اُس کو بھی اک طرزِ فغاں سمجھا کیا

کچھ نہ پوچھو لو لگائی عشق سے خود شوق نے
بیٹھے بیٹھے سوزِ دل سوزِ جگر پیدا کیا

تمھارا گھر تھا تمھیں اُس کو کیا مٹانا تھا — ہمارا کعبۂ دل اس طرح نہ ڈھانا تھا
عجب تھا کہ وہ بھر لاتے آنکھوں میں آنسو — کہیں کہیں سے یہ قصہ انھیں سنانا تھا
بلند ہوتے نہ کس طرح نالۂ پُر شور — سوا فلک کے نہ اُن کا کہیں ٹھکانا تھا
اُڑا کے لے گئی بادِ صبا پسِ مُردن — چمن میں کیا نہ مری خاک کا ٹھکانا تھا

دلِ حزیں کو کوئی پوچھتا نہیں اب شوق
کبھی حسینوں میں اس کا بھی اک زمانہ تھا

سنہ ۱۹۱۸ء

لامکاں نام ہے اُجڑے ہوئے ویرانے کا
ہو کے عالم میں ہے مسکن ترے دیوانے کا

شوقِ رسوا کوئی دیکھے ترے دیوانے کا
خود وہ آغاز بنا ہے کسی افسانے کا

جامِ دل بادۂ الفت سے بھرا رہتا ہے
واہ کیا ظرف ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

داستاں عشق کی ہم پوری سنائیں گے کلیم
قصۂ طور تو اک باب ہے افسانے کا

شمع نے بزم میں جل جل کے جلایا آخر
آہ کیا حشر ہوا عشق میں پروانے کا

مستتر قلقلِ مینا میں ہے رازِ مستی
بھید کس طرح کھلے پھر ترے مستانے کا

حشر میں دیکھ کے مجمع لبِ کوثر ساقی
پھر گیا آنکھوں میں نقشہ ترے میخانے کا

ملتے ہی ساغر و شیشہ سے چھلک جاتا ہے
یہ بھی کیا دور ہے ساقی ترے پیمانے کا

کیا قیامت ہے کہ محشر میں بھی پرسش نہ ہوئی
حشر اب دیکھیے کیا ہو ترے دیوانے کا

صفحۂ دل مرا آئینۂ رمزِ توحید
رازِ کونین خلاصہ مرے افسانے کا

شوق اب کس لیے فکرِ مے و میخانہ ہے
بھرنے والا تو کوئی اور ہے پیمانے کا

سنہ ۱۹۱۹ء

تیرا دیوانہ قیامت میں بھی عریاں نکلا
عشق ۔ دل ساز کوئی بے سر و ساماں نکلا

کسی بے مہر کو اپناتا ہے مرے دل کی تلاش
خاک میں اس کو ملا کر بھی نہ ارماں نکلا

اور کیا چاہیے دیوانے کو اے دستِ جنوں
میرا دامن ہی پھٹا میرا گریباں نکلا

داد خواہی کا طلبگار نہ تھا دل لیکن
ستم ایجاد وہی خود زود پشیماں نکلا

دلِ خود سر سے کہو اور بھٹکا نہ ڈھونڈھے
مدتوں ٹھوکریں کھاتا وہ پریشاں نکلا

ناتوانی تجھے اب کوئی کہاں تک روئے
ضعف سے نالۂ بیتاب بھی لرزاں نکلا

جو کچھ افتاد پڑی اُس کو اُٹھایا دل نے
کام مشکل تھا مگر عشق میں آساں نکلا

دلِ شوریدہ تڑپتا ہی رہا پہلو میں!
جبکہ خالی مری قسمت سے نمکداں نکلا

ہجر میں صبر و سکوں تاب و تواں کھو بیٹھے
شوقؔ سا بھی نہ کوئی بے سر و ساماں نکلا

سنہ ۱۹۱۹ء

لبریز لہو سے ہے وہ پیمانہ ہمارا
قاتل ہے نرالا کوئی مستانہ ہمارا

یا ہر حدِ امکاں سے تھا ویرانہ ہمارا
ہو حشر بھی محشر میں جداگانہ ہمارا

آئے ہیں ترستے ہوئے میخانہ میں ساقی!
بھر دے تو یہی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہمارا

تم چشمِ فسوں ساز پہ آشوب نہ کرنا
سنتے ہیں کبھی آئے جو افسانہ ہمارا

اب جائیں کہاں چھوڑ کے اے پیرِ مغاں ہم
مدت میں ملا ہے درِ میخانہ ہمارا

شاید کبھی تنہائی میں کہہ گذرے یہ کچھ حال
لیجائیے ہم سے دلِ دیوانہ ہمارا

ہستی میں بھٹکتے ہوئے آئے تھے عدم کو
پھیرا تھا یہاں ایک فقیرانہ ہمارا

کعبہ ترا اے شیخ رہے تجھ کو مبارک!
کافی ہے ہمارے لیے بتخانہ ہمارا

اے مستِ ازل چل تجھے کچھ سیر کرادیں
یہ شیخ کی مسجد ہے وہ میخانہ ہمارا

لے لیں ابھی ہم ساقیٔ مے نوش ہی ساغر — کچھ ساتھ جو دے لغزشِ مستانہ ہمارا
قسمت ہی جو پھوٹی ہو تو ساقی کا گلہ کیا — گردش سے ہی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہمارا

جو دیر تھا اے شوق وہی بیت حرم ہے
کعبہ جسے کہیے وہی بتخانہ ہمارا

۱۹۳۱ء

سوادِ شامِ غربت یا نشاں ہے داغِ ہجراں کا — یہ اُجڑے گھر کی شب ہے یا دھواں ہے آہِ سوزاں کا
چلو اے وحشیو! بڑھ کر خبر لو جیب و داماں کی — بہار آئی جنوں بجنے لگا چاک گریباں کا
تم اپنے مرہموں کی کاش اب بھی کچھ تو سن لیتے — نہ جانے کیا اثر ہو دل جلوں کی آہِ سوزاں کا
بقائے زندگی ہے منحصر سوزِ محبت پر — نہ ہوگا زخمِ دل اے چارہ گر مرہونِ احساں کا
ہمارے ناتواں ہاتھوں کی دیکھے کوئی مجبوری — عجب حسرت سے منہ تکتے ہیں داماں و گریباں کا
نمک پاشِ جراحت وہ ملاحت ریز جلوہ ہے — کہ ہے زخمِ دلِ بیتاب آئینہ نمکداں کا
سلام اے تیرہ بختی شامِ غم کی اب سحر ہوگی — چراغِ زندگی بجھنے کو ہے بیمارِ ہجراں کا

عجب کچھ تلاطم خیز ہے ہر بوند آنسو کی
ہے عالم دیدۂ پرجوش میں اک شوقِ طوفاں کا

۱۹۲۴ء

الٰہی آج کیوں منہ فق ہے ایسا شامِ ہجراں کا — ہوا ہے خونِ ناحق کیا کسی دل کے ارماں کا
تری ترچھی نظر اے ناوک افگن کیا کہوں کیا ہے — پتہ سینہ میں ملتا ہے نہ دل ہی کا نہ پیکاں کا

ڈبوئی آبرو دل کی ہماری چشمِ پرنم نے
چھپا آخر نہ اُس سے رازِ میرے سوزِ پنہاں کا

پڑے ہیں مست متوالی نہ کہتے ہیں نہ سنتے ہیں
نئی بستی نیا عالم ہے یہ شہرِ خموشاں کا

ذرا پھیلاتے ہم بھی پاؤں اپنے خوابِ غفلت میں
بھروسہ شوق کچھ ہوتا اگر عمرِ گریزاں کا

سنہ ۱۹۱۸ء

اے شوق رنگِ گریہ ہے بالکل کھلا ہوا
اشکوں میں ہے صاف خونِ جگر ہے ملا ہوا

پہلے تو خود ہی شوق سے آتے تھے دل میں وہ
اب کیوں ہے ناوکوں کا تری رُخ پھرا ہوا

چھیڑو نہ بزم میں دلِ حرماں نصیب کو
بیٹھا ہوا ہے پہلو میں کب سے بھرا ہوا

حسرت بھری نگاہ نے کچھ کہہ دیا نہ ہو
قاتل کا ہاتھ اُٹھتا ہے کچھ کچھ رُکا ہوا

پوچھو نہ بار بار دلِ گم شدہ کا حال
کیا جانے کس نے لے لیا کیا جانے کیا ہوا

ہمدم نہ مجھ سے حالتِ چشمِ پُرآب پوچھ
ڈر ہے چھلک نہ جائے یہ ساغر بھرا ہوا

ہم پر جو ظلم جور کئے تم نے کیا کہیں
اب اُن کا ذکر کیا ہے جو کچھ بھی ہوا ہوا

سنتے ہیں آج شوق کی حالت کچھ اور ہے
با دوستش بخیر دیکھیے کیا ماجرا ہوا

سنہ ۱۹۱۸ء

مرنا مریضِ عشق کے حق میں شفا ہوا
اچھا ہوا نجات ملی، کیا بُرا ہوا

راہِ عدم کی منزلِ اوّل میں کیا ہوا
جو آیا خاک ڈال کے مجھ پر ہوا ہوا

نشتر کو ڈوبنے نہ دیا اے رگِ جنوں — کیا اُس کا ایک قطرۂ خوں میں بھلا ہوا
جس دل کے داغ سے ہمیں تھی چشم روشنی — رہتا ہے وہ تو شام ہی سے خود بجھا ہوا

بس ایسی چارہ سازی سے اے شوقؔ باز آ
جس سے کہ درد اور بھی دل میں سوا ہوا

۱۹۲۱ء

بیخودی میں نشۂ عرفاں سے میں محرم ہوا — ساقیا جامِ سفالیں میرا جامِ جم ہوا
ہو وہی بوچھار پھر تیرِ نگہ اے ناوک فگن — آبِ پیکاں دے کہ زخمی پیاس سے بیدم ہوا
دل جلایا سوزشِ پنہاں نے تیرے دیکھتے — خاک بھی تجھ سے نہ کچھ اے دیدۂ پرنم ہوا
رازِ ہستی کو نہ جانا ہوش میں جبتک رہے — بیخودی میں قلب پر طاری عجب عالم ہوا
رو رہے تھے ہم تو دل کو درد بھی جاتا رہا — ایک کیا کم تھا کہ پیدا دوسرا یہ غم ہوا
بیکسی میں کیا کوئی رکھے کسی سے کچھ امید — درد تھا ہمدم وہی اُٹھ کر شریکِ غم ہوا
دل کی وارفتہ مزاجی پہلے ہی سے کم نہ تھی — اور اُس کی گمرہی کو گیسوؤں میں خم ہوا
خوفِ پامالی سے اُٹھے فتنہ ہائے حشر بھی — آمدِ قاتل سے محشر میں نیا عالم ہوا

گریۂ بے سود سے اے شوقؔ کچھ حاصل نہیں
دیکھتے ہو کیا مآلِ ہستیٔ شبنم ہوا

۱۹۲۱ء

حشر میں حشر نیا دیکھیے برپا ہوگا — میں ہی کیا دادطلب سارا زمانہ ہوگا

ان کے اندازِ ستم دیکھ رہا ہوں لیکن / کچھ اگر منہ سے نکالوں گا تو شکوا ہوگا
صبح تک اور تڑپ لے جو تڑپنا ہے تجھے / پھر نہ ہم ہونگے نہ تو اے دلِ شیدا ہوگا
قصد کعبہ تھا مگر دیر میں ہم آ پہونچے / اس سے بہتر کوئی گیا اور ٹھکانا ہوگا
دل سے پوچھا کیا کرتا ہوں میں تنہائی میں / ارے ناکام تباہ تو بھی کسی کا ہوگا
آج ساقی کو بھی کچھ آنکھ چراتے ہی بنی / ساغرِ دل کسی سرمست کا ٹوٹا ہوگا

شکوۂ گردشِ تقدیر عبث ہے اے شوق
جو کہ ہونا تھا ہوا اور جو ہوگا ہوگا

سنہ ۱۹۲۰ء

بس اک پھاہا نمک کا ٹیس پر بھجانے میں رکھ دینا / دہانِ زخم پر خنجر نہ تڑپانے میں رکھ دینا
ہجومِ شوقِ نظارہ سے بچی ہوش پہ نظریں / کھینچی شمشیر دیکھو تم نہ شرمانے میں رکھ دینا
بوقتِ امتحاں اے دل رہے کچھ پاسِ خودداری / کہیں سر پائے قاتل پر نہ گھبرانے میں رکھ دینا
مرا سودائی دل ہے دیکھنا ہشیار تم رہنا / کبھی اس کو نہ بھولے سے پریخانے میں رکھ دینا
ذرا ایجانہ ہو کر میں ابھی آتا ہوں اے ساقی / میری حصے کی جو کچھ ہو وہ پیمانے میں رکھ دینا
عجب کیا ہے جو صورت دل بہلنے کی نکل آئے / بتِ مہوش کی اک تصویر بتخانے میں رکھ دینا
رہے تا یاد تجھکو خاکسارِ مست کی ساقی / مرا جامِ سفالیں اپنے میخانے میں رکھ دینا
ازل سے پہلے گر حسنِ ازل ملتا تو میں کہتا / ذرا سی وحشتِ دل اور دیوانے میں رکھ دینا
سر موجود ہی کہدیگا وہ سب حالِ پیشانی / دلِ صد چاک کو اے شوق تم شانے میں رکھ دینا

سنہ ۱۹۲۳ء

دل میں آتی ہی ستمگار یہ کیا — بے سبب برسرِ پیکار یہ کیا
میری سنتا ہی نہیں دل کچھ بھی — کہہ دیا کرتا ہے ہر بار یہ کیا
سچ کہو دل میں تمھارے کیا ہے — دم بخود ہو دمِ گفتار یہ کیا
سخت جاں بھی تو نہیں میں ایسا — دم چرانے لگی تلوار یہ کیا
کیوں بلا کر سرِ بالیں اُن کو — خامشی اے لبِ اظہار یہ کیا
شیخ کے ہاتھ میں تھی کل تسبیح — آج گردن میں ہے زنّار یہ کیا
میکدے کی تجھے پھر یاد آئی — خیر تو ہے دلِ ہُشیار یہ کیا
مجرمِ عشق کی سُنیے تو سہی — عرض کرتا ہے گنہگار یہ کیا
شکوۂ جور تمھارا ہی نہ ہو — سُن لو کہتا ہے دلِ زار یہ کیا
دن کو تارے نظر آتے ہیں مجھے — روزِ روشن ہے شبِ تار یہ کیا

شوقؔ اُٹھو بھی چلو دیکھ نہ لیں
دو قدم ہے درِ دلدار یہ کیا

سنہ ۱۹۲۳ء

کیا کہیں ہم کیا محبت میں ہمیں حاصل ہوا — دل ہی واقف ہے جو کچھ آخر مآلِ دل ہوا
خوابِ غفلت کیا بتائیں ہوشیاری ہو گئی — جس قدر کھلتی گئیں آنکھیں یہ دل غافل ہوا
رہروِ ملکِ عدم کا کچھ پتہ ملتا نہیں — راستہ کیوں کر کٹا کب واردِ منزل ہوا

جوشِ طوفاں میں مری کشتی نہ روکے رک سکی — دیکھتے ہی دیکھتے غائب لبِ ساحل ہوا

دیکھ لی تاثیرِ جذباتِ محبت دیکھ لی! — کر دیا اُس کو فنا اِک عشق جو کامل ہوا

گلشنِ ہستی میں آکر اور کیا رکھتے امید — جوشِ گریہ۔ اضطرابِ شوقِ دل حاصل ہوا

اپنی سی پائے طلب نے سعی کی پر کیا خبر — عازمِ منزل ہوا یا رہروِ منزل ہوا

بارہا جس در پہ جا کر کچھ نہ شنوائی ہوئی
آفریں صد آفریں شوق اُس سے پھر سائل ہوا

سنہ ۱۹۲۳ء

جھگڑا تو کچھ مرے دلِ ناشاد سے ہوا — لیکن نہ فیصلہ ستم ایجاد سے ہوا

کیا کم ہے یہ کہ ہم بھی اسیرِ قفس ہوئے — حاصل تو کچھ نہ کچھ ہمیں فریاد سے ہوا

اِک ہی رگِ گلو تھی وہ کاٹے نہ کٹ سکی — کچھ بھی نہ تیرے خنجرِ فولاد سے ہوا

ضبطِ فغاں قفس میں بھی پاسِ ادب سے ہے — خاموش ہیں تو خاطرِ صیاد سے ہوا

واقف ہے حسن و عشق کے جھگڑے سے کون تھا — پیدا یہ قصہ عالمِ ایجاد سے ہوا

ناداں بن کے پوچھیے مجھ سے نہ حالِ دل — جو کچھ ہوا یہ آپ کی بیداد سے ہوا

برہم نہ اتنے آپ ہوں اک اُف نکل گئی — پہلا قصور یہ دلِ ناشاد سے ہوا

کچھ بھول سا گیا ہے وہ اندازِ دل شکن — اُمید کیا تھی کیا ستم ایجاد سے ہوا

اے شوق شاعروں میں جو مخدوم ہو گئے
جو کچھ ہوا وہ خدمتِ اُستاد سے ہوا

۱۹۲۳ء

دمِ آخر زباں کا ساکت از گفتار ہو جانا
مگر کچھ ہچکیوں کا خود لبِ اظہار ہو جانا

بہانہ موت کا ہی محوِ چشمِ یار ہو جانا
مبارک اے اجل تجھ کو مرا بیمار ہو جانا

اب بس ہو بڑھکے آثارِ جنون و ضبط کیا ہو تے
کسی سے کچھ نہ کہنا آپ سے بیزار ہو جانا

دلیلِ ہوشیاری ہے تری دیوانگی یہ بھی
کہ پہلے مست ہونا اور پھر ہشیار ہو جانا

بتائے کیا عجب حالت ہے ناکامِ تمنا کی
کہ اپنے ہی دلِ مایوس سے بیزار ہو جانا

ہماری زندگی تو منحصر ہے دورِ صہبا پر
کبھی سرمست ہو جانا کبھی سرشار ہو جانا

خزاں بھی آگئی صیاد نے پیچھا نہیں چھوڑا
تلاشِ صید میں اب بھی اُسے گلزار ہو جانا

نرالے ڈھنگ تم نے عشق میں اے شوق سیکھے ہیں
کبھی باکار ہو جانا، کبھی بے کار ہو جانا

۱۹۲۳ء

کر کے قول و قرار کیا کہنا
او فراموش کار کیا کہنا

ہو کے نادم گنہ سے پاک ہوا
واہ رے شرمسار کیا کہنا

کام بگڑے تو ہی بناتا ہے
اے مرے کردگار کیا کہنا

خوب تو نے سُنی لگی دل کی
واہ رے غمگسار کیا کہنا

دن کو تارے دکھا دیے تو نے
اَے شبِ انتظار کیا کہنا

خاک میں بھی ملا کے اَے ظالم
نہ کیا اعتبار کیا کہنا

دلِ حسرت زدہ رہا نہ رہا
اُس کا قول قرار کیا کہنا

اُس سے حالِ غمِ دلِ مظلوم
جو نہ ہو شرمسار کیا کہنا

باوفائی بھی تیری اے دلِ زار
رہ گئی یادگار کیا کہنا

نہ سُنے ایک بار جو دل کی
اُس سے پھر بار بار کیا کہنا

خم کے خم شوق کردئے خالی
اے مرے بادہ خوار کیا کہنا

۱۹۲۳ء

دل چُرانا نظر نہیں آتا
لے کے جانا نظر نہیں آتا

آمد و شد بھی دل کی ہے اندھیر
آنا جانا نظر نہیں آتا

سوزِ پنہاں نے ہائے خاک کیا
کچھ جلانا نظر نہیں آتا

کسی حیلے اجل نہیں ٹلتی
کچھ بہانا نظر نہیں آتا

بتکدہ چھوڑتے تو چھوڑ دیا
دل ٹھکانا نظر نہیں آتا

درِ دلدار چشم حق بیں کو
کس نے مانا نظر نہیں آتا

نقشِ ہستی مٹا رہا ہے کوئی
پر مٹانا نظر نہیں آتا

دردِ پنہاں کا سینہ میں رہ کر
گھر بنانا نظر نہیں آتا

چشمِ دل وا ہوئیں تو پھر اُن میں
خواب آنا نظر نہیں آتا

۱۵

شوق کس رنگ میں ہو تم ڈوبے
کیا زمانہ نظر نہیں آتا

۱۹۲۳ء

کبھی خدا کا نہ دم بھر بھی شرمسار رہا
تمام عمر بتوں پر مگر نثار رہا

وفا شعاری میں قاصر نہ زینہار رہا
بتوں کے آگے میں ناحق ہی شرمسار رہا

یہی وہ دل ہے کہ جس پر کبھی تھا ناز مجھے
وہی یہ دل ہے نہ اب اس کا اعتبار رہا

وہ ایسے کون ہیں جو دل کو اپنا کہتے ہیں
ہمارا تو کبھی اُس پہ نہ اختیار رہا

وہاں تھا تمکنت حسن و ناز پر غرّہ
یہاں مگر کشش دل ہی پر مدار رہا

پتہ بتانے کو اک دل جلے کے مرقد کا
اگر رہا تو چراغ سر مزار رہا

ہماری عمر قفس میں کٹی یہ کیا معلوم
خزاں کب آئی تھی کب موسم بہار رہا

ازل سے رشتۂ زنار سے تعلق تھا
تمام عمر ہمارے گلے کا ہار رہا

مجھے تو اُن کی نزاکت نے کر دیا مجبور
جو آہ کھینچی تو اس میں بھی اختصار رہا

سرور بادۂ وحدت گیا نہ تا دم مرگ
وہ مست میں ہوں کہ غفلت میں ہوشیار رہا

یہ کیسی بادہ پرستی تھی جو رہے غافل
یہ کیا ہے شوق ابھی تک نہیں خمار رہا

۱۹۲۳ء

عشق میں کیا دل ہمیں یاس و حرماں ہو گیا
خاتمہ تا صبح اے شام غریباں ہو گیا

چاکِ دامن کی خبر کا حس ہی تھا کچھ سلسلہ
کیا وہ ای دستِ جنوں چاکِ گریباں ہو گیا

کیوں نہ پہلی سی خلش دل میں مری باقی رہی
ہنسو رہتے تیر بھی کیا دشمنِ جاں ہو گیا

میں تو دل ہی کو سمجھتا تھا کہ وہ ہے بے وفا
روتے روتے تجھکو کیا ای چشمِ گریاں ہو گیا

عالمِ ہستی بھی کیا تھا اک سماں عبرت کا تھا
جو سُنا دیکھا تھا سب خوابِ پریشاں ہو گیا

دل نے پھر پہلو میں آتے ہی بپا کیں شورشیں
ہم تو سمجھے تھے کہ خاکِ کوئے جاناں ہو گیا

کوئی کچھ سمجھے دلِ مضطر کی خاموشی کو شوق
میں تو سمجھا ہوں سکونِ دردِ پنہاں ہو گیا

سنہ ۱۹۲۳ء

نہ ای دل صورتِ شیخِ حرم دیوانہ بنجانا
کہیں آنا نہ جانا زائرِ بت خانہ بن جانا

تمھاری دیدۂ مخمور کو یہ خوب آتا ہے
کبھی شیشہ کبھی ساغر کبھی پیمانہ بن جانا

عجب عالم ہے مدہوشوں کا تیری جوشِ مستی میں
کبھی دیوانہ بن جانا کبھی مستانہ بن جانا

دلِ سوزاں دکھانا جلوۂ حسن و عشق دونو کا
کہیں شمعِ شبستاں اور کہیں پروانہ بن جانا

یہ بھی تلقین ساقی وقتِ رخصت اپنی مستوں کو
کہیں دیوانہ بن جانا کہیں فرزانہ بن جانا

اسی میں کچھ مزا اپنا نظر آیا حسینوں کو
کہ جا کر دیر میں چھپکے بتِ بتخانہ بن جانا

کرشمے ہیں یہ ساری جلوۂ حسنِ حقیقی کے
کہیں عاشق کہیں اندازِ معشوقانہ بن جانا

نو لئے رازِ سانہ عشق بیخود کیوں نہ کر ڈالے
کہ ہر پردے سے آتی ہے صدا دیوانہ بن جانا

یہی عبرت سرائے دہر کا ہر روز نقشہ ہے
کہیں کاشانہ ہو جانا کہیں ویرانہ بن جانا

خبر کس کو تھی یوں عالم میں رسوائی مری ہوگی
کہ عنوانِ محبت کو بھی تھا افسانہ بن جانا

یہ عالم بیخودی عشق کا اے شوقؔ کیا کہیے
تصور میں کسی کے آپ سے بیگانہ بن جانا

۱۹۲۳ء

آ کے محفل میں ہوئے آپ پریشاں کیا کیا
نیچی نظروں نے کیا اور پشیماں کیا کیا

در سے کعبے گئے کعبے سے بت خانے کو
دل کے بہلانے کو موجود تھی ساماں کیا کیا

کیا عجب ہے کہ رفوگر کو ضرورت ہو کبھی
جمع کر لائے ہیں ہم تارِ گریباں کیا کیا

دلِ ناکام کو امید دلائی سب کچھ
پر مچلتا ہی رہا وہ تہِ داماں کیا کیا

دل کے پردے سے جو باہر کبھی نکلے ہی نہ تھے
خاک میں جا کے ملے ہیں وہی ارماں کیا کیا

دہنِ زخم تو ویسے ہی کھلے ہیں اب تک
تم نے خالی کیے گو آج نمکداں کیا کیا

چٹکیاں لیتے ہیں اے شوقؔ جگر میں سوفار
چھیڑتے ہیں دلِ مجروح کو پیکاں کیا کیا

۱۹۲۴ء

شبِ غم آہ بر لب آمدہ بیمارِ ہجراں تھا
عجب حسرت کا عالم تھا ہجومِ یاس و حرماں تھا

وفا اے شوقؔ کو دل سے بھلا دینا تو آساں تھا
مگر اے بھولنے والے ترا کیا اس سے پیماں تھا

سمجھتے خاک کیا ہم دلفریبی ہائے عالم کو
نظارہ ہستیٔ فانی تو اک خوابِ پریشاں تھا

بڑھا دستِ جنوں پردہ دری کو وائے ناکامی
لباسِ تن میں مدت سے گریباں تھا نہ داماں تھا

مری قاتل کی کوئی دیکھتا حیرت سرِ مقتل — اِدھر زخموں کے منہ وا تھے اُدھر خالی نمکداں تھا
کھٹک سی جس جگہ رہتی تھی ہر دم میرے سینے میں — ٹٹولا چارہ گر نے پر نہ کچھ اُس جا نمایاں تھا
ہماری وسعتِ دل کا سمجھ لو اس سے اندازہ — جہاں اک نوکِ پیکاں تھی وہیں پہ درد پنہاں تھا
دمِ رخصت تنِ خاکی سے نکلی روح یہ کہہ کر — بسر کرتی کہاں تک اُس میں کیسا تنگ زنداں تھا

ذرا اے شوق سمجھو کیا ہے یہ نیرنگیٔ عالم
جواب تک تم کو سمجھایا کئے وہ وقفِ نسیاں تھا

سنہ ۱۹۲۷ء

دل ہی پوچھو کیا ہوا تھا اور کیوں خاموش تھا — آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بس ہوش تھا
وہ بھی کیا تاثیر تھی جس نے ہلائے سب کے دل — کیا بتاؤں وہ مرا ہی نالہ پُر جوش تھا
محفلِ ساقی میں تھا کچھ اور ہی مستوں کا رنگ — کوئی ساغر ڈھونڈتا تھا اور کوئی بیہوش تھا
کیا عجب ہے جائزہ لے مے پرستوں کا کوئی — یاد رکھنا ساقیا مجھ سا بھی اک مے نوش تھا
کیا سمجھ سکتا تھا کوئی تیرے دیوانے کی چپ — جب کسی نے اس سے کچھ پوچھا تو بس خاموش تھا
بیخودی سی نشۂ جامِ خودی اُترا تو پھر — ایک ہی ساغر ملا ایسا کہ میں مدہوش تھا
اک ہمیں کو ساقیا پوچھا نہ تو نے دور میں — ورنہ میخانہ میں تیرے شورِ نوشا نوش تھا
کس قدر تھا اشتیاقِ منزلِ مقصود اُسے — مرنے والے کا جنازہ آج دوشادوش تھا
زندگی بھر کے گناہوں سے یہ تھی شرم اے اجل — تارکِ ہستی یہاں سے جب چلا روپوش تھا

غنچے کیوں خاموش آئے گلشنِ ہستی میں شوق
موسمِ گل سے مگر خوفِ خزاں ہمدوش تھا

سنہ ۱۹۳۲ء

کون سی وہ شمع تھی دل جس کا پروانہ ہوا
اور پھر لو بھی لگی ایسی کہ دیوانہ ہوا

ساقیِ سرمست ہے جبتک کہ پینے کو بڑھوں
ہاتھ سے گرتے ہی چکنا چور پیمانہ ہوا

دل حریمِ ناز سے لیکر تو ہم نکلے مگر
ہو گیا عالم کچھ ایسا سب سے بیگانہ ہوا

خیر تھی الفت میں دل نے رنگ کچھ بدلا نہ تھا
اب تماشہ دیکھیئے گا وہ بھی دیوانہ ہوا

ہم نے جانے کیا کہا لوگوں نے کیا سمجھا اُسے
سرگذشتِ درد دل تھی جس کا افسانہ ہوا

فیض ساقی نے بدل دی صورتِ دل ورنہ ہی
پہلے پیمانہ تھا پیمانہ سے میخانہ ہوا

میری لب تک آتے آتے کیوں چھلک جاتا ہے شوق
جام رنگیں ساغرِ گل یا کہ پیمانہ ہوا

سنہ ۱۹۳۲ء

پردۂ حُسن سے گر عشق نمایاں ہوگا
دیکھنا دل مرا آئینۂ عرفاں ہوگا

تیری پھر دستِ جنوں خاک رہے گی پروا
جب نہ دامن ہی رہے گا نہ گریباں ہوگا

حسن کی پردہ دری شوق نہیں گر منظور
دیکھنا عشق ہی پھر دست بداماں ہوگا

کیا کہوں وسعتِ صحرائے جنوں او واعظ
اے کیا اس سی سوا حشر کا میداں ہوگا

رند ہو جائیں گے دم بھر میں غریقِ رحمت
حشر کیا تیرا بتا۔ دفترِ عصیاں ہوگا

تم نے دیکھی ہی نہیں تیرِ نظر کی پرواز — یہ مرے دل ہی نکلتے ہی پر افشاں ہوگا

بیخودی عشق کی خود رکھتی ہے پنہاں دل میں — یہ وہ ہے راز عیاں ہو کے نہ پنہاں ہوگا

چشمِ بینا کے لیے ذوقِ نظر ہے درکار — حسن اک آئینۂ عالمِ امکاں ہوگا

ٹھوکروں سے جسے پامال کیا ہنس ہنس کر
غور سے دیکھ تو وہ **شوق** کا ارماں ہوگا

سنہ ۱۹۳۲ء

کہاں تک ضبطِ گریہ اور غش دو دو پہر ہونا — مبارک **شوق** دل کو مائلِ دردِ جگر ہونا

خلش تھی، درد تھا، بیتابیٔ دل یادِ جاناں تھی — یہاں مدِ نظر کب تھا شبِ غم کی سحر ہونا

نشیمن ہے نہ گلچیں ہے۔ فضا گلشن کی بدلی ہے — مبارک اے قفس والو تمہیں بے بال و پر ہونا

شبِ ہجراں۔ سوزِ غم۔ یہ داغِ دل ہیں اور میں ہوں — مرے کس کام آیا آپ کا رشکِ قمر ہونا

نہ ہونگی انتخابِ دل میں پھر دشواریاں کچھ بھی — ابھی تو سیکھ لو اے ناوک فگن اہلِ نظر ہونا

کمالِ عشق میں احساس اتنا ہو ہی جاتا ہے — بتا دیتے ہیں آہِ بے اثر اور با اثر ہونا

حریفِ جلوۂ کثرت نہ تھا گو پردۂ وحدت — فریبِ حسن سے لازم تھا لیکن باخبر ہونا

بھٹک کر پیچھے رک جائے نہ کوئی رہروِ منزل — دلیلِ رہنمائی ہے مرا گردِ سفر ہونا

ازل سے ساتھ ہم کیوں لائے حسن و عشق کے جھگڑے — بھلا یہ بھی خطا تھی کوئی دنیا میں بشر ہونا

نہ جانے **شوق** تم نے جذبۂ الفت کو کیا سمجھا
مناسب تھا جنونِ عشق سے کچھ بہرہ ور ہونا

سنہ ۱۹۳۲ء

دل بہلنے کا جہاں میں کوئی ساماں نہ ہوا
اپنا ہمدرد کبھی عالمِ امکاں نہ ہوا

شکوۂ ہجر نہ بھولے سے بھی آیا لب پر
روبرو ان کے میں خود کردہ پشیماں نہ ہوا

ہمنشیں پوچھ نہ حالِ دلِ ناکام ازل!
یہی حسرت رہی پورا کوئی ارماں نہ ہوا

بیخودی میں یہ ہے عالم ترے دیوانوں کا
فصلِ گل آئی مگر چاک گریباں نہ ہوا

کوئی کیا جانے کہ کیا لطفِ خلش ہے حاصل
میرا ہی دل ہے کہ منت کشِ درماں نہ ہوا

یوں تو ہمدردِ زمانہ تھا بظاہر لیکن
کسی صورت سے علاجِ غمِ پنہاں نہ ہوا

بیدھڑک جانے کی ہمت نہ ہوئی محشر میں
منہ چھپانے کے لیے دستِ بداماں نہ ہوا

دل بہلتا بھی تو کس طرح بہلتا شبِ غم
سازوساماں نہ ہوا نغمۂ حرماں نہ ہوا

پرسشِ حال پہ آنکھوں میں بھر آئے آنسو
ایسے مجبور ہوئے ضبط بھی آساں نہ ہوا

ذرہ ذرہ سے عیاں حسن کی رعنائی ہے
وہ حسیں تو ہے کہ پردوں میں بھی پنہاں نہ ہوا

میں تھا مشتاق ترے جلوے کا اے مایۂ حسن
رہ کے پردہ میں بھی تو شعلۂ عریاں نہ ہوا

چین سے قیدِ تعین میں بسر کی اے **شوق**
دل بھی جمعیتِ خاطر سے پریشاں نہ ہوا

سنہ ۱۹۳۲ء

ہم کو رسوائے زمانہ ذوقِ منزل نے کیا
اور اس پر پا شکستہ سعیٔ باطل نے کیا

رازِ سربستہ تڑپ کر فاش بسمل نے کیا
میں بھی کہتا ہوں کیا جو کچھ کہ قاتل نے کیا

خونِ ناحق کی شہادت مل گئی اچھا ہوا
اِک زمانہ بھر کو شاہد رقصِ بسمل نے کیا

سیکڑوں ارماں ہزاروں حسرتیں اور ایک دل
ہم کو مستغنی جہاں سے جذبِ کامل نے کیا

میرے گرداب فنا میں ہوش ہی قائم نہ تھے
کچھ نہ دیکھا کیا اشارہ موجِ ساحل نے کیا

اشتیاقِ دیدِ جاناں میں مدد کی ضبط نے
سخت دشواری تھی آساں جسکو مشکل نے کیا

رقصِ بسمل دیکھنے کو سب چلے آئے مگر
چھوٹے منہ سے یہ نہ نکلا کیا یہ قاتل نے کیا

شوقؔ دیکھو عشق میں دیر و حرم دونوں گئے
کس قدر گمراہ تم کو وہمِ باطل نے کیا

سنہ ۱۹۳۲ء

جب نہ بستر سے ناتواں اُٹھا
وہ بھی بالیں سے بدگماں اُٹھا

کچھ نہ کہتے بنی بروزِ حشر
جس کو دیکھا وہ بے زباں اُٹھا

اے دلِ ناصبور تیرے لئے
درد بھی بہرِ امتحاں اُٹھا

ہم کو یارائے ضبط جب نہ رہا
داغِ پنہاں سے کچھ دھواں اُٹھا

آشیاں اب بنائیں کس کے لیئے
آب و دانہ تو باغباں اُٹھا

چشمِ خوں بار رو رہا کیا کہنا
لطفِ گریہ پسِ فغاں اُٹھا

اُف رے اے شوقِ بزم آرائی
کوئی بھی تو نہ شادماں اُٹھا

بے کسوں کی نہ تو نے ایک سُنی
شورِ نالوں کا ناگہاں اُٹھا

شوق کی کچھ خبر بھی ہی تجھکو
تیری محفل سے نیم جاں اُٹھا

۱۹۳۳ء

محبت میں اگر جانا تو یہ رشکِ قمر جانا
تجھے نا آشنا بے مہر اور بیداد گر جانا

محبت میں ستم سہہ سہہ کے اپنے آپ مر جانا
نہ کچھ دشوار تھا عشاق کو یہ کام کر جانا

زمانہ جانتا ہی خوب جیسے ہو وفا دشمن
مری آہوں کو تم نے کیا سمجھکر بے اثر جانا

اِسی کو عشقِ پروانہ کی خامی شمع کہتی ہی
نہ لا کر تاب نظارہ بھری محفل میں مر جانا

اُٹھائے جب قدم صحرا نوردی کیلئے ہم نے
بیابانِ جنوں کو وسعتِ حدِ نظر جانا

لحد میں سونے والیکی ہیں نیندیں کس قیامت کی
جو سویا اُس نے اِس منزل کو جائے بے خطر جانا

ستم کیشی، جفا سنجی، تلاشِ دردِ ناکامی
بجز اُس کے محبت میں نہ کچھ بھی عمر بھر جانا

کچھ ایسا دلفریبی نے زمانے کی دیا دھوکا
تلاشِ منزلِ مقصد کو دور درد سر جانا

سہارا مل گیا چلتے چلاتے بارِ عصیاں کا
بہت مُدت میں ہم نے اس کو سامانِ سفر جانا

مریضِ غم کی تسکیں ہو بھی سکتی ہی کسی صورت
بتا تو کچھ ہمیں بھی تو نے کیا اے چارہ گر جانا

ہم ایسے ناتواں تھی کارواں سے رہ گئے پیچھے
کہ اتنا بھی نہ منہ سے کہہ سکے آگے ٹھہر جانا

تری کشتے جو آ کر رہ گئے گنجِ شہیداں میں
قیامت تک کہا کس نے تھا اُن کو یاں ٹھہر جانا

شہیرِ نامور کے میکدے کا وہ ہی دردی کش!
بجا ہی شوق کو گر میکشوں نے بیخبر جانا.

سنہ ۱۹۳۲ء

سب کچھ ملا جو موقعِ عذرِ خطا ملا
اس کے سوا کچھ اور نہ روزِ جزا ملا

دُنیا ملی کسی کو غمِ ما سوا ملا
سب کچھ ملا خدائی میں ہم کو خدا ملا

آخر کو تھک کے بیٹھ گئے راہِ شوق میں
ڈھونڈھا بہت مگر نہ کوئی رہنما ملا

اِک نامرادِ عشق کی اُف بیکسی نہ پوچھ
بالیں پہ اِک چراغ تھا وہ بھی بجھا ملا

شب بھر چمن میں رہ کے نکالی گئی جو تو
اب تو بتا دے تجھکو وہاں کیا صبا ملا

حسرت نہ آرزو نہ تمنا نہ درد و غم
ہے مجھکو دل پہ ناز کہ بے مدعا ملا

ہم ایسے کم نصیب ہیں دنیائے عشق میں
اِک دِل ملا تھا وہ بھی جلا اور بُجھا ملا

طے کر کے راہِ عشق کو حاصل ہوئی مُراد
چلتے چلاتے جادۂ راہِ بقا ملا

ناکامیوں سے حسرت و حرماں کا ہے ہجوم
جو کچھ ملا تجھی سے دِلِ پُر جفا ملا

تم مانو یا نہ مانو کہے جاؤں گا یہی
ہاں ہاں تمہیں سے یہ ستمِ ناروا ملا

ہم جانتے ہیں شوق کو ہے جیسا پارسا
شہرت مگر یہی ہے کہ اِک پارسا ملا

سنہ ۱۹۱۶ء

چار پھولوں کو نہ ترسائیے گا
قبر پر میری اگر آئیے گا

دیجیے مجھکو نہ گیسو کی قسم
کچھ کہوں گا تو بگڑ جائیے گا

آپ پوچھیں نہ تمنائے وصال
رمز کی بات ہے گھبرائیے گا

پھر بہم بہکی ہوئی باتیں کیسی — کیا زباں دیکھے بدل جائیے گا
دل تو اپنی سی کہے گا ہر بار — اب زباں اس کی نہ کھلوائیے گا
کیا کہوں آپ سے اپنی بیتی — اس کو سُنیئے گا تو جھنجھلائیے گا
دل سُنے گا نہ تمھاری اے شوق
کچھ نہ کمبخت کو سمجھائیے گا

۱۹۱۶ء

ستاکر ستمکش کو کیا پائیے گا — جو کی کچھ شکایت تو جھنجھلائیے گا
اجازت اگر دے دے تمکین ناز — اشاروں ہی میں کچھ تو فرمائیے گا
وہ برقِ تجلّی کی ہے جلوہ گاہ — وہیں حضرتِ دل نہ رہ جائیے گا
ادب کی جگہ مرنے والو ہے قبر — سمجھکر یہاں پاؤں پھیلائیے گا
وہ میں ہوں جسے بھول بیٹھی ہیں آپ — اگر ہو سکے یاد فرمائیے گا
نہ جانے وہ سودا زدہ کیا کہے — زباں اُس کی ناحق نہ کھلوائیے گا
غریب اب تو قدموں میں ہے آپڑا — دلِ ناتواں کو نہ ٹھکرائیے گا
تشفی بلاکش کو دے دیجیے — سُنی اوس کی بیتی تو گھبرائیے گا
خبر بھی ہی کچھ بارِ عصیاں کی شوق
ہوئی واں جو پرسش تو شرمائیے گا

۱۹۳۲ء

کس کو پروا ہے کہ وہ کشتۂ حرماں رہا
دل پہ درد تھا لذت کشِ درماں رہا

شعلۂ حسن بھی فانوس میں عریاں نہ رہا
داغِ دل شوقؔ ۔ چراغِ تہِ داماں رہا

جامہ زیبی میری وحشت میں کوئی کیا دیکھے
واہ رے وسعتِ جنوں کوئی بھی ساماں رہا

کیسا دلکش تھا وہ نظارۂ بزمِ امکاں
دل کو اب وسوسۂ خوابِ پریشاں رہا

چشمِ مشتاق نے در پردہ مگر دیکھ لیا
ایک جلوہ تھا کہ سو پردوں میں پنہاں نہ رہا

وحشتِ دل کے لئے تھی وہ فضائے دلکش
یاد لیکن ہمیں جولاں گہہ امکاں رہا

دل کے گم ہونے کا افسوس نہ ہوتا لیکن
ہمدمِ عشق وہ منزلِ عرفاں نہ رہا

دیکھا او بانیٔ بیداد یہ نیرنگِ جہاں
تیری قبضہ میں بھی وہ خنجرِ عریاں نہ رہا

رحمتِ حق نے بڑھا دی تھی یہاں تک ہمت
کہ خطاوار کو اندازۂ عصیاں نہ رہا

دیکھتے دیکھتے نیرنگِ زمانہ اے شوقؔ
کوئی اظہارِ غم و درد کا عنواں نہ رہا

۱۹۳۱ء

دل کی دھڑکن کیا گئی اک دل کو سودا ہو گیا
درد اک جاتا رہا اک درد پیدا ہو گیا

اے فریبِ دید تیری سحر سازی دیکھ لی
حسن خود بیں کی بدولت دل بھی رسوا ہو گیا

تو نے بدلی باغِ عالم کی فضا رنگِ بہار
کچھ نہ تھا گلزار میں کل آج کیا کیا ہو گیا

رنگ لائیں حسن کی نیرنگیاں اللہ رے جوش
عشق کا بیٹھے بٹھائے سر میں سودا ہو گیا

اک اشارہ نے تری سو حسرتوں کی جان لی
تو نے آنکھیں پھیر لیں خونِ تمنّا ہو گیا

کھینچا کرتا ہی زمیں پر کچھ لکیریں بیٹھ کر
تیرا دیوانہ بھی گویا اک تماشہ ہو گیا

دیکھکر نشتر پھڑک اُٹھی رگِ جوشِ جنوں
فصلِ گُل آنے نہ پائی تھی کہ سودا ہو گیا

بیخودی میں اپنے دیوانوں کو ہی ذوق یہ نہیں
وہ اگر چونکے تو سمجھو حشر برپا ہو گیا

کیسا بتخانہ کہاں کا دیر کیسی خانقاہ
جس جگہ سجدہ کیا ہم نے وہ کعبہ ہو گیا

انتہائے ضبط سے بھی کام کچھ نکلا نہ شوقؔ
نالہ لب پر آتے ہی تمہیدِ شکوہ ہو گیا

مہرِ خاموشی رہی لب پر رہا جب تک کہ ہوش
بیخودی میں شوقؔ رازِ دل ہویدا ہو گیا

۱۹۳۲ء

تماشہ ہی ہجومِ مدعا کیا
تمنائے دلِ درد آشنا کیا

خزاں جب آ گئی خوفِ فنا کیا
چمن میں رہ کے اُمیدِ بقا کیا

سمجھتے ہیں جو ہے انجام اُس کا
کوئی تدبیر دردِ لا دوا کیا

وفا کیشی بھی کام آئی نہ اُن پر
تغافل ہائے بیجا کا گلا کیا

جو وقت آنیکا تھا اُس پر نہ آئی
تو اب آکر کریگی اے قضا کیا

ہجومِ یاس و ناکامی حسرت
مجھے تو نے دیا یہ اے قضا کیا

ندامت پردہ پوشِ معصیت ہے
دُعائے مغفرت اب بینوا کیا

ہوئے ہیں اب تو خود وہ سر بہ زانو
تلافی ہائے جورِ ناروا کیا

محیطِ غم میں امواجِ فنا ہیں — کوئی سمجھائے مجھکو ناخدا کیا
کہاں تک میٹھی نیندیں سونے والو — سنو تو کہتی ہی بانگِ درا کیا
مزے کی تھی وہ رودادِ محبّت — ابھی سے ختم قصّہ ہوگیا کیا

نہ سمجھا شوقؔ سمجھانے سے کچھ بھی
کہو اس میں کسی کی ہے خطا کیا

۱۹۳۳ء

زاہد بھی ترکِ مے کی قسم کھا کے پی گیا — دیکھتے ہی شیشے میں للچا کے پی گیا
کیا جانے کیا تھا جام میں گھبرا کے پی گیا — ساقی کے دستِ فیض سے کچھ پا کے پی گیا
زاہد نے میکدہ میں یہ اندھیر کر دیا — جو کچھ شراب خم میں تھی سب آ کے پی گیا
میخانے جاتے ہی میرے دل کی جھجک گئی — ساقی کے اک اشارہ سے شرما کے پی گیا
کیا کہیئے جام گر گیا ہاتھوں سے دور میں — جو مے بچی کچھی تھی وہ جھنجلا کے پی گیا
کیا جانے کب سے تھا ترا سوفار تشنہ لب — خونابۂ جگر مرا سب آ کے پی گیا

پیرِ مغاں یہ شوقؔ کی ہمّت سے دور تھا
جامِ شراب رندوں کو ترسا کے پی گیا

۱۹۳۳ء

پھیر لیں آنکھیں مُروّت دیکھنا — اپنی اُلفت دیکھنا میری مُحبّت دیکھنا
دو ہی دن میں کیا سے کیا تم ہوگئے — آئینہ میں اپنی صورت دیکھنا

ڈھونڈھنے پر بھی نشاں ملتا نہیں | مرمٹوں کی شانِ غربت دیکھنا
آہ سے در پردہ اُس کو لاگ ہے | آئینہ کی یہ کدورت دیکھنا
دادِ مہجوری کی پھر ہے جستجو | دے نہ دھوکا اپنی قسمت دیکھنا
توبہ کرنا تو بہت آسان ہے | پھر بدل جائے گی نیت دیکھنا
منزلِ دُنیا نہیں آرام گاہ | ہے ابھی روزِ قیامت دیکھنا
کر لے او سفاک ہر جور و جفا | رہ نہ جائے کوئی حسرت دیکھنا

کعبہ سے تبخانہ میں آ ہی گئے
کھینچ لائی شوق قسمت دیکھنا

۱۹۳۳ء

اللہ رے نصیب دلِ پُر ملال کا | پیشِ نظر ہے آئنہ حسن و جمال کا
محشر میں دیکھیے کہ نبٹتی ہے کس طرح | دیکھا کبھی نہیں ہے وہ عالم جلال کا
سمجھا ہوں اب کہ ہے یہ فریبِ طلسمِ حسن | جمتا نہیں ہے نقش جو چشمِ خیال کا
اللہ رے دل فریبیٔ نیرنگِ عاشقی | دھندلا سا نقش ہے تری بزمِ خیال کا
موسیٰ سا شخص طور پہ بیہوش ہو گیا | ایسا ہوا اثر تری برقِ جمال کا
مدہوش مجھکو ایک ہی جرعہ نے کر دیا | کیا معجزہ ہے یہ مری جامِ سفال کا

محشر میں ہوگی نامۂ اعمال پر نظر
اے شوق کچھ بھی خوف نہیں دیکھ بھال کا

سنہ ۱۹۳۵ء

خوگرِ جور و جفا تا حدِّ امکاں کر دیا
تو نے دل کو اے خدا کیوں آفتِ جاں کر دیا

پی گئے ہم آنسوؤں کو تا کہ رسوائی نہ ہو
ضبط نے گھٹ گھٹ کے لیکن پھر نمایاں کر دیا

خود بخود چشمِ تماشائی بھی جھپکی طور پر
حسن کے جلوے نے دیکھا کیسا حیراں کر دیا

یہ تمنا تھی کہ گھٹتی اور دردِ ہجر میں
چارہ سازوں نے مگر پابندِ درماں کر دیا

حسنِ پنہاں ایک تو خود ہی کرشمہ ساز تھا
تیری خود بینی نے اُس کو اور عریاں کر دیا

کائناتِ چشم تھا صرف ایک قطرہ اشک کا
ہیچ سرمایہ تھا تاہم زیبِ داماں کر دیا

رو رہے تھے بیٹھ کر صبحِ وطن کی یاد میں
تو نے آوارہ عبث شامِ غریباں کر دیا

نالۂ خاموش نے وارفتگانِ عشق کے
ہر دلِ شوریدہ کو محشر بہ داماں کر دیا

انقلابِ دورِ وحشت آفریں صد آفریں
دل کی دنیا کو مری تو نے پریشاں کر دیا

کون تھا جز اشک تمہیدِ بیانِ دردِ دل
عشق نے اے شوق اُس کو زیبِ عنواں کر دیا

سنہ ۱۹۳۶ء

وفا شعار کو تو نے ذلیل و خوار کیا
جفا پرست یہ کیا شیوہ اختیار کیا

اُٹھائے سر نہ اُٹھا دل کا پردۂ غفلت
خطا ہوئی کہ اُن آنکھوں پہ اعتبار کیا

نگاہِ مستِ حقیقت تو دے چکی تھی جواب
مگر یہ دل ہی تھا پھر اُس نے ہوشیار کیا

نہ وہ تڑپ رہی دل میں وہ رہی سوزش
علاج کیا تھا یہ کیا تو نے غمگسار کیا

دکھا کے جلوۂ باطل کی اِک جھلک اے حسن
خدا کے بندہ کو ناحق گناہگار کیا

کسی کے بس کا دلِ مضطرب تھا لیکن
ہمیں نے خوگرِ اندوہِ انتظار کیا

خیالِ عشق نے رحمت سے بھی رکھا محروم
یہ کیا کیا کہ گناہوں پہ اعتبار کیا

کہے میں آکے دلِ ناصبور کے ہم نے
تمام شب ترے آنے کا انتظار کیا

تمھیں تو خاک میں ملنا تھا مل گئے آخر
جہاں میں شوق عبث اُن کو شرمسار کیا

۱۹۳۸ء

پیشِ نگاہ پردۂ محمل نہیں رہا
اے دل حجاب اب کوئی حائل نہیں رہا

سیراب ہوتے آب تموج سے خشک لب
حیرت ہے کیوں میں تشنۂ ساحل نہیں رہا

اے بیخودیٔ شوق کہاں لے چلی مجھے
کیا تجھکو یادِ جادۂ منزل نہیں رہا

اب کیسے اُس کے تیرِ نظر کا ہدف بنوں
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

بڑھتا ہی آگے یا کہ سفر ختم ہو چکا
دھیان اُس کا کچھ ہمیں سرِ منزل نہیں رہا

موجوں کو ہے شکایتِ محرومیٔ وصال
اے عشق دیکھنا لبِ ساحل نہیں رہا

آخر کچھ انتہا بھی تھی بیداد و جور کی
زیبِ کمر وہ خنجرِ قاتل نہیں رہا

کیا جانے کیا اسیروں پہ افتاد پڑ گئی
زنداں میں اب وہ شورِ سلاسل نہیں رہا

بحرِ فنا میں شوق سفینہ ہے زیست کا
تقدیر دیکھنا لبِ ساحل نہیں رہا

۱۹۳۸ء

بیخود تو ہوں لیکن مجھے غافل نہ سمجھنا
غفلت کو مری پردہ حائل نہ سمجھنا

ہی دشمنِ جاں دِل کسی قابل نہ سمجھنا
تم مزرعۂ امید کا حاصل نہ سمجھنا

بسمل کی تڑپ دیکھ کے دھوکے میں آنا
اس کو کہیں پا بوسیٔ قاتل نہ سمجھنا

دیوانہ میں وحشت بھی ہی سودائی جنوں بھی
لیکن اُسے پابند سلاسل نہ سمجھنا

کر غور ذرا دل میں نظر آئے گا جلوہ
پردہ میں نہاں لیلی محمل نہ سمجھنا

کس درجہ بلا کی ہی کشش پائے طلب میں
اُس در پہ پہونچنا کوئی مشکل نہ سمجھنا

وحشت میں کہاں جاؤ وہ صحرائے جنوں سے
دیوانہ کو آسودۂ منزل نہ سمجھنا

آئینہ ہی کیا حسن کی ہر شان تجلی
ہر جلوہ کو نیرنگیٔ محفل نہ سمجھنا

دریائے محبت میں نمایاں ہی تلاطم
ہر موج بلاخیز کو ساحل نہ سمجھنا

ہی عشق حقیقی کے تصور کا نتیجہ
اے شوق اُسے جذبہ باطل نہ سمجھنا

۱۹۳۸ء

ہی حاصلِ محبت ضبطِ فغاں نہ کرنا
لائے نہ رنگ تازہ داغوں کا پھر اُبھرنا

تیور بدل بدل کر آنکھوں میں بات کرنا
شوخی سے خود بگڑنا خود شرم سے سنورنا

دل بھی تڑپ رہا ہی آہیں مچل رہی ہیں
آنکھوں پہ بس نہیں ہی دیکھو نہ چھیڑ کرنا

ہی دل میں درد پیہم سمجھا ہوں اُس کو ہمدم
اب ساتھ وہ ہی دیگا ہر دم دم اُن کا بھرنا

اے عشق تا بہ ساحل پہنچیگا کب سفینہ ڈوبا جو بحر غم میں مشکل ہے پھر ابھرنا
کیا ہے عیب عدو کچھ بول منہ سے ظالم خالی نہیں ہے حسرت یوں دل پہ ہاتھ دھرنا
یہ شوخی و تلون یہ ضد رہے گی کب تک سچ تو بتا یہ کیا ہے ہر بات سے مکرنا
ظالم نہ کوئی سمجھے الزام کچھ نہ رکھے ظلم و ستم سے بچ کر جو جی میں آئے کرنا

اے شوق راہ الفت ممکن نہیں کہ طے ہو
کیسے قدم کہ سر کو دشوار ہے گزرنا

سنہ ۱۹۳۸ء

پھر وہ مقتل میں لیے خنجر فولاد آیا بانی ظلم و ستم برسر بیداد آیا
آئے دن لب پہ مری شکوۂ بیداد آیا ضبط جب ہو نہ سکا طالب فریاد آیا
پھر وہی دل میں تصور وہی دل میں ہے خیال بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا
عمر آخر ہوئی باقی نہ رہا جوش و خروش یاد آیا بھی تو کس وقت خدا یاد آیا
نالوں کو ضبط کیا آہ و فغاں تھی بے سود ہاتھ میرے نہ کبھی دامن فریاد آیا
سیر کونین میں وہ عالم ہو دیکھ لیا کچھ پسند ہم کو مگر عالم ایجاد آیا
دل کے بہلانے کو سوجھی نہ تھی کوئی تدبیر خود بہلنے لگا جب حسن خداداد آیا
ہوش گم ہو گئے ایسے کہ خبر تک نہ رہی آج میں کوئی خرابات میں کیا یاد آیا
اے جنوں عشق میں کچھ قید تعین ہی نہیں اس نے جو دل سے بھلایا نہ وہ پھر یاد آیا

دل کو کھو بیٹھے تھے مدت ہوئی ہم نوائے شوق
پھر ستانے کو وُہی خانماں برباد آیا

سنہ ۱۹۳۸ء

جھلک تھی جلوہ کی لیکن وُہ بے حجاب تھا — نگاہِ شوق کا در پردہ کچھ جواب تھا
خودی کے نشہ میں دل مائلِ شراب تھا — وہ ایک پردۂ غفلت تھا مستِ خواب تھا
بہار آئی کھلے پھول ہر فضا بدلی — مگر یہ دل ہی تھا جس میں کہ انقلاب تھا
نسیمِ صبح نے غنچوں سے چھیڑ چھاڑ جو کی — چمن میں عارضِ گل کوئی بانقاب تھا
یہاں بھی کب ہمیں روزِ جزا کی کچھ پروا — ہمارا دفترِ عصیاں تو بے حساب تھا
ہوا نہ ہم کو کچھ احساسِ جوشِ بیتابی — فریبِ سوزشِ دل تھا یہ اضطراب تھا
سوال کو میرے گو تیری تمکنت سمجھی — مگر وہ چپ ترا رہنا کوئی جواب نہ تھا
ہجومِ موجِ فنا سے محال تھا بچنا — کسی کے ہاتھ میں وہ ساغرِ حباب تھا
ہزار آفتیں گو دل کے ساتھ تھیں لیکن — غریقِ موجۂ بدمستئ شباب نہ تھا
کبھی وہ کعبہ بنا اور کبھی وہ بت خانہ — یہ اور کیا تھا اگر دل کا انقلاب نہ تھا

صلائے عام تو ساقی کی تھی مگر اے شوق
ہمارے میکدہ میں شیشۂ شراب تھا

سنہ ۱۹۳۸ء

دنیائے بیخودی تھی کیا جانے میں کہاں تھا — جب ہوش کچھ آیا بیہوشی کا گماں تھا

وحشت میں سر کو دُھننا دشتِ جنوں مکاں تھا | زیبِ قدم زمیں تھی وحشی ترا رواں تھا
کیوں میرا ایسا دشمن کمبخت باغباں تھا | وہ شاخ کاٹ ڈالی جس پہ کہ آشیاں تھا
سجدے میں کیوں نہ کرتا دل میں تھا جذبِ کامل | میری جبیں پہ شوق اور اُس کا آستاں تھا
قصہ تھا طولِ غم کا ختم اُس کو کیسے کرتے | کہنے سے رہ گیا جو محفوظ داستاں تھا
صیاد و دوست گلچیں دونوں ہی تھے ستمگر | یہ تاک میں چمن کے وہ دشمنِ فغاں تھا
پہونچے جو آستاں تک دیکھی عجب تجلّی | پھر ہوش تھا یہ کس کو جلوہ کہاں کہاں تھا
آتے ہی شامِ فرقت نالوں نے سر اُٹھایا | ہلچل تھی اک زمیں پہ حیرت میں آسماں تھا
مشتاق بن کے آئے روداد عشق سننے | کیا کہتا ان سے آخر دل خود ہی بے زباں تھا
رہ رہ کے پوچھنا کیا کس نے کیا ہے بسمل | تیرا ہی تو وہ ظالم اک تیرِ جاں ستاں تھا
میں دل سے پوچھتا ہوں کچھ تو بتا دے آخر | کیا تجھ کو ہو گیا تھا جب وقتِ امتحاں تھا
بچھڑے ہوؤں کی حسرت دیکھی گئی نہ ہم سے | غربت میں جس نے چھوڑا وہ اپنا کارواں تھا

دُنیا بھی جائے عبرت کوئی نہ تھا کسی کا
کیا خود غرض بھی بندے اے شوق میں جہاں تھا

١٩٣٩ء

جو پردہ پیشِ نظر تھا ہٹا کے دیکھ لیا | حریمِ ناز میں اک جلوہ جا کے دیکھ لیا
بساطِ عشق کو دل نے بچھا کے دیکھ لیا | رہی سہی تھی جو دولت لٹا کے دیکھ لیا
تم ایسے روٹھے ہوئے کو منا کے دیکھ لیا | ہنسا کے دیکھ لیا اور رلا کے دیکھ لیا

تمھیں تو اپنی جفاؤں کی یاد کیا ہوگی
ملا کے خاک میں بندۂ خدا کے دیکھ لیا

دکھا دکھا کے ستم پر ستم کئے تم نے
یہ بدلے خوب تجھے میری وفا کے دیکھ لیا

وہ میرا دل تھا جفا کیش و جور ورد طلب
خیال کچھ بھی نہ آیا ستا کے دیکھ لیا

رہے نہ حسرت و ارماں نہ آرزو باقی
وہ دل کہاں ہے اسے کیا مٹا کے دیکھ لیا

غضب کی تھی وہ نگاہِ حیا نواز تری
ادھر پھری کہ اُدھر مسکرا کے دیکھ لیا

نہ ہونا تھا نہ ہوا ایک سجدہ بھی مقبول
سرِ نیاز کو ہر جا جھکا کے دیکھ لیا

کسی کی یاد نے بیچین کس قدر رکھا
سکون کچھ نہ ہوا غم بھلا کے دیکھ لیا

یہ کیسا خواب کہ سُدھ بُدھ رہی نہ کچھ تن کی
تجھے بھی نیند کے ماتے جگا کے دیکھ لیا

بدی تھی قیدِ قفس جاتے ہم کہاں بچ کر
ہزاروں کانٹوں سے دامن چھڑا کے دیکھ لیا

کجا یہ جذبۂ کامل کجا حجابِ جمال
ہزار پردوں میں اُن کو بلا کے دیکھ لیا

کہا جو میں نے کہ آخر ہو کس سے شکوۂ جور
کسی نے سوئے فلک مسکرا کے دیکھ لیا

سُنی نہ شوقؔ کی کچھ سرگزشت غم افسوس
جو دل دکھا تھا اُسے کیا دکھا کے دیکھ لیا

ردیف (ب)

سنہ ۱۹۳۲ء

وحدت و کثرت کے جلوے ہیں عیاں دل کے قریب
ضو فشاں ہے نقشِ اصلی نقشِ باطل کے قریب

پردہ دل سے خود اُٹھیگا چشمِ دل سے کر نظر
دیکھ مجنوں جلوۂ لیلیٰ ہے محمل کے قریب

ایک ٹھوکر سے نہ مل جائے حیاتِ جاوداں
دل سمجھ کر تو تڑپنا پائے قاتل کے قریب

ڈھونڈتے ہی رہ گئے طوفاں میں گرداب فنا
ہم نے کب چاہا تھا رہنا ہیچ ساحل کے قریب

تشنہ لب ہوں ساقیا کچھ دور کی حاجت نہیں
شیشۂ مے لا کے رکھدے دستِ سائل کے قریب

خاک پروانوں کی تھی اور سوختہ کچھ پر بھی تھے
عبرت افزا اک سماں تھا شمعِ محفل کے قریب

الامداد اے تاب و طاقت ضعف کی حد ہو چکی
اب قدم اُٹھتے نہیں آتے ہی منزل کے قریب

دل سا رہبر ساتھ دیگا نا امیدی کس لیئے
جا ہی پہونچیں گے کبھی ہم حدِ فاصل کے قریب

کچھ ٹھٹک کر دیکھ لینا رہروانِ کوئے دوست
ایک جادہ سہل بھی ہے راہِ مشکل کے قریب

شوق گو دیوانہ ہے پر دشت پیما تو نہیں
ڈھونڈیئے اس کو کسی جا اپنی محفل کے قریب

ردیف (د)

سنہ ۱۹۳۲ء

سناؤں گا جو قفس میں کھلی زباں صیاد
کہ تیرے سننے کے قابل ہے داستاں صیاد

کہاں تک اُس کو ہے یاد وہ فضائے چمن
نہ دیکھا جس نے ہو مدت سے آشیاں صیاد

نہ پوچھ شوق اسیری کی لذتیں مجھ سے
تری تلاش میں پہونچا کہاں کہاں صیاد

غضب یہ ہے کہ وہ سنتا نہیں اسیروں کی
ستم یہ ہے کہ ہے ظاہر میں بے زباں صیاد

جو تجھ کو کہنا ہو کہدے وہ سب اشاروں میں — سمجھ میں کچھ نہیں آتی تری زباں صیاد

ہنوز میں نے قفس میں زباں نہیں کھولی — ابھی سے ہوگیا کیوں مجھ سے بدگماں صیاد

نہ آشیاں کی خبر ہے نہ کچھ قفس کا پتہ — چلا ہی لیکے خدا جانے اب کہاں صیاد

نیا اسیر ہوں کہدے جو تیری مرضی ہو — کروں بھی یا نہ کروں نالہ و فغاں صیاد

اِک آہ کی بھی نہ اُمید شوقؔ سے رکھنا
علاج کیا۔ جو ہوا ایسا ہی ناتواں صیاد

ردیف (ر)

۱۹۱۸ء

آتشِ دل اور بھڑکی بزمِ جاناں دیکھکر — آ گئے آنکھوں میں آنسو شمع سوزاں دیکھکر

گردِ صحرائے جنوں سے ستر پوشی ہوگئی — آ گئی وحشت کو عبرت مجھکو عریاں دیکھکر

جیب و دامن میں جنوں ایک تار بھی باقی نہ تھا — کیا اُٹھاتے انگلیاں خارِ مغیلاں دیکھکر

حسرتیں روکے ہوئے ہیں سینۂ زخمی کی راہ — آڑے ترچھے وہ لگائیں تیرِ مژگاں دیکھکر

کیا خبر کہ دم زدن میں دل کی کیا حالت ہے — آپ ہی ان میں سے چن لیں کوئی ارماں دیکھکر

یہ کسے معلوم تھا اُٹھنا پڑیگا حشر میں — سو گئے تھے بے خبر گورِ غریباں دیکھکر

کیا خبر تھی تم مسل ڈالو گے دل کو اور بھی — عرضِ حالِ زار کی تھی تم کو پرساں دیکھکر

شوقؔ کس کے حُسن کے تم محوِ نظارہ ہوئے
کون سا جلوہ تھا جس کو تم ہو حیراں دیکھکر

سنہ ۱۹۱۸ء

نکلے حسرت بھی تری اے دلِ ناداں کیونکر — پار ہو جائیں جگر سے ترے پیکاں کیونکر
یہ تو ممکن ہی وہ آجائیں شبِ وعدہ۔مگر — چھوڑ کر جائے گی مجھکو شبِ ہجراں کیونکر
بعد مردن نہ ہوئی دستِ جنوں جامہ دری — حشر میں پیشِ خدا جاؤں گا عریاں کیونکر
اضطرابِ دلِ بیتاب تو تھمتا ہی نہیں — آپ لیجائیں گے اُس کو تہِ داماں کیونکر
آمد و شد ہی نفس کی تری ہستی معلوم — ہو بھروسہ ترا اے عمرِ گریزاں کیونکر
دامنِ تیغ کے سایہ میں چلا ہوں چھپکر — مجھ کو دیکھے گا کوئی حشر میں عریاں کیونکر

شوقؔ یہ دل تو اُنھیں کی سی کہا کرتا ہی
دشمنِ جاں سے ہو امیدِ وفا ہاں کیونکر

سنہ ۱۹۲۰ء

چرا نہ آنکھ کو ساقی کہ بادہ نوش ہوں میں — ابھی تو فیصلہ ہوتا ہے ایک ساغر پہ
مریضِ عشق کی حالت کبھی نہ سنبھلے گی — مجھے تو چھوڑ دے اے چارہ گر مقدر پہ
ہمارے نالے بھی تھک تھک کے اب تو بیٹھ رہے — گئے وہ دن کہ اُٹھاتے تھے آسمان سر پہ
ہمارے میکدہ کو چھوڑ کر نہ جا زاہد — ملے گا قطرہ نہ کمبخت حوضِ کوثر پہ
تمھارے جور کے شکوے بھی کیا کریں ہم سے — اب اس کا فیصلہ ہونے دو روزِ محشر پہ

جو رکھدیں دستِ تشفی وہ سینہ پر میرے — تپش کو نام نہ رہے پھر نہ قلبِ مضطر پر

گلا نہ ہم نے کیا **شوق** کچھ ستمگر سے
بلائیں سب وہ اُٹھائیں جو آ پڑیں سر پر

ہیں جیسے اُن کے پردے پڑ گئے کیوں چشمِ گریاں پر — جگر کو رات بھر روتے کٹی ہے قلبِ سوزاں پر
نہ رکھا نام کو بھی تار باقی جسمِ عریاں پر — کبھی احساں کیا تھا ہم نے بھی خارِ مغیلاں پر
دلِ گستاخ ہی کو میں نے پہلو میں نہیں رکھا — چلو جانے بھی دو اب خاک ڈالو دشمنِ جاں پر
جراحت ہائے دل سے کیا کہوں کچھ بن نہیں پڑتی — نظر ہر بار پڑتی ہے ترے خالِ نمکداں پر
میرے دستِ جنوں کا جوشِ وحشت میں یہ عالم ہے — کبھی پڑتا ہے دامن پر کبھی چاکِ گریباں پر
زبانِ حال سے کچھ کشتگانِ ناز کہہ دیتے — جو آ جاتے کبھی بھولے سے وہ گورِ غریباں پر
کھٹک ہے درد ہے۔ سوزِ نہاں ہے آہ و بیتابی — ترس آتا نہیں اُس کو مری حالِ پریشاں پر
جگر مجروح۔ آہِ آتشیں لب پر۔ تپش دل میں — جلے جاتے ہیں دشمن بھی ہماری ساز و ساماں پر
بھلے کو محفلِ واعظ میں تو یہ یاد بھی آئی — چڑھا آئے تھے اُس کو بھول کر ہم طاقِ نسیاں پر
یہ تھا جوشِ محبت وقتِ رخصت سب اسیروں نے — مری تصویر کھچوالی در و دیوارِ زنداں پر
اڑائیں جامۂ اصلی کی ہم نے دھجیاں سو سو — رہا کیا جو بڑھے دستِ جنوں اب جیب و داماں پر
مجھے اے **شوق** یادِ رفتگاں جب کچھ ستاتی ہے — تو رہ جاتے ہیں اکثر چند قطرے نوکِ مژگاں پر

بتوں کے آگے سجدہ کرتے کس نے **شوق** کو دیکھا
غضب ہے۔ ایسی تہمت اور کس پر اک مسلماں پر

سنہ ۱۹۲۱ء

تمھارا دل بھر آیا ہو جو یادِ مرگِ دشمن پر
چلو آنسو بہانا بیٹھکر عاشق کے مدفن پر

تجلی نور کے پردہ میں کیا کیا رنگ لاتی ہے
شعاعِ حسن ہوتی ہے تصدق بڑھکے چلمن پر

پڑی ہے ہر طرف ہلچل سی اک شہرِ خموشاں میں
یہ کون آیا ہے بہرِ فاتحہ بیکس کے مدفن پر

دہانِ زخم کچھ بھی بخیہ گر سے کہہ نہیں سکتے
یہ اُن پر خندہ زن وہ خندہ زن ہیں اسکی سوزن پر

بنا ہوں میں شکارِ حسرت و اندوہ و مایوسی
دلِ بے درد بھر آئے نہ کیونکر اُس کے شیون پر

پریشاں کیوں ہے زندان و سلاسل کے تصور میں
ہنسی آتی ہے شوق ہم کو دلِ وحشی کی اُلجھن پر

سنہ ۱۹۲۳ء

بتائیں کیا کہ آئے ہیں کہاں سے ہم کہاں ہو کر
نشاں اپنے ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر کا بے نشاں ہو کر

بھلانے کو دلِ شیدا کے ساری پردہ داری تھی
عیاں ہو تم نہاں ہو کر نہاں ہو تم عیاں ہو کر

ہماری خاک کے ذرے فنا ہو کر بھی چمکیں گے
عروج اپنا دکھائیں گے یہ نجمِ آسماں ہو کر

دلِ آوارہ کیوں تجھ کو خیالِ کوئے جاناں ہے
ارے ناداں کہاں جاکر رہیگا بے نشاں ہو کر

خزاں کے آتے ہی رنگِ چمن بدلا تو ہم بولے
اسیرانِ قفس سے مل گئے ہم شادماں ہو کر

یہ دورِ میکشی ہر وقت محوِ دید رکھتا ہے
کہاں آنکھوں میں یہ غفلت لیے ہے خوابِ گراں ہو کر

مسلماں ہو کے ترکِ بت پرستی ای معاذ اللہ
خدا کو ہم نے پہچانا ہے شیدائے بتاں ہو کر

یہ بارِ مصیبت منزل گردی اور شامِ تنہائی
چلے ہیں کیا سمجھکر ہم بھی رسوائے جہاں ہو کر

ابھی کیا جانے کیا کیا رنگ وہ اے شوق بدلیگا
زمیں پر آکے کریگا حشر برپا آسماں ہوکر

سنہ ۱۹۲۴ء

نہ نکلا نالۂ خاموش آہ پر شرر ہوکر — رہا سینہ میں پنہاں ہمدم دردِ جگر ہوکر
ابھی شامِ شبِ غم ہی میں ہے اپنی دِگرگوں حالت — خدا جانے طبیعت رنگ کیا بدلے سحر ہوکر
مجھے اس حال پر پہونچا دیا جس کے تغافل نے — میری بالیں پہ بیٹھا ہے وہی اب نوحہ گر ہوکر
بلا خیزیٔ صحرا اور سوادِ شامِ غربت میں — نہ تنہا چھوڑ اے ہمدم مجھ کو میرا ہم سفر ہوکر
تمیزِ نیک و بد اے شوق دیکھو تم کو لازم ہے
تعجب ہے بنے انجان تم اہلِ نظر ہوکر

سنہ ۱۹۲۵ء

چلا ہے شوق بتخانہ کو مردِ با خدا ہوکر — یہی ہے ابتدا جو ختم ہوگی انتہا ہوکر
نہ وہ بے پردہ آئے آج تک بزمِ تصور میں — حیا بنکر رہے آنکھوں میں دل میں مدعا ہوکر
یہ کیا کم ہے ملا روزِ ازل ہم کو غمِ دنیا — وہاں سے اور کیا لاتے رہینِ التجا ہوکر
وہ رہ رہ کر کھٹک بھی اب نہیں ہوتی مرے دل میں — ستم ہے وہ مٹی جاتی ہے درد لادوا ہوکر
غضب کی ہیں جنونِ شوق کی سرگرمیاں دل میں — نہ لائیں رنگ یہ نالے کہیں شورش فزا ہوکر
نہیں دستِ دعا کا بھی سہارا نا امیدی میں — کوئی مانگے تو کیا مانگے گدائے بینوا ہوکر
یہاں تک ضبط نے اب تو کیا ہے محوِ خاموشی — شکستِ دل بھی رہ جاتی ہے سازِ بے صدا ہوکر

تمھاری کج ادائی بھی لگاوٹ سے نہیں خالی
سماں جاتی ہے نظروں میں ادائے دلربا ہو کر

تمامی عمر گذری شوق زندان عناصر میں
رہے دنیا میں ہم آزاد پابند بلا ہو کر

کرو فکر سفر اے شوق کھوٹی راہ ہوتی ہے
عبث بیٹھے ہو غافل گوش بر بانگ درا ہو کر

ردیف (ض)

سنہ ۱۹۳۶ء

نام وفا تو مٹ گیا تیری بلا کو کیا غرض
دل کو مرے دکھائے جا ترک جفا سے کیا غرض

لب پہ ہے مہر خامشی آہ نہیں فغاں نہیں
درد ہی جب نہیں رہا ہم کو دوا سے کیا غرض

پہلو سے دل وہ لے گئے دیکھتے ہم بھی رہ گئے
ہونا تھا جو وہ ہو گیا آہ و بکا سے کیا غرض

شور وہ اب نہیں دل کی تڑپ بھی وہ نہیں
کس کو خبر وہ کب بجھے صبح و مسا سے کیا غرض

خانۂ دل ہے بے مکیں آیئے گھر ہے آپ کا
پھر نہ منھ چھپائیے یوں شرم و حیا سے کیا غرض

ذوق فنا کی بھی کشش شوق کے مارے مرمٹے
عشق سے مل گئی بقا خوف قضا سے کیا غرض

باغ نہیں چمن نہیں ہے نہ وہ شاخ آشیاں
کنج قفس ہے اور ہم رنگ فضا سے کیا غرض

منزل عشق ہے قریب اب تو قدم اٹھائیے
شوق جنوں ہے راہ بر بانگ درا سے کیا غرض

ردیف (ک)

۱۹۳۶ء

نہیں ملتا نہیں ملتا تلاشِ بے نشاں کب تک
ہمیں دھوکے میں رکھیگا غبارِ کارواں کب تک

اثر ہی جب نہو اے دل جبیں فرسائیاں کب تک
بس اب پہنچ دی ارمانِ سجودِ آستاں کب تک

بہار آئی فضا بدلی اری فطرت کے سودائی
رہیگا بے نیازِ رنگ و بوئے گلستاں کب تک

کہاں وہ جلوہ آرائی کہاں یہ شوقِ نظارہ
پسِ پردہ فریبِ حسن کی نیرنگیاں کب تک

نگاہِ شوق تجھ کو ڈھونڈھ ہی لیگی جہاں تو ہے
اری او چھپنے والے چشمِ حق بیں سے نہاں کب تک

نہ دل ہی اپنے قابو میں نہ ہی یارائے گویائی
یہ کیا معلوم ہے ہوگی مکمل داستاں کب تک

لبوں پر مہرِ خاموشی سرِ تسلیم خم تا کے
وفا کیشی میں اے سفاک ہوگا امتحاں کب تک

زمانہ تجھ کو کیا کہتا ہے ننگ و نام کے دشمن
سبق آموز ہوگی تیری رسوائیاں کب تک

نگاہوں کے کرشمہ۔ شوخیِ ناز و ادا توبہ
فسوں سازی رہیگی یہ نصیبِ دشمناں کب تک

ضرورت ہے کہ ہو تجدید کچھ مشقِ تصور میں
وہی نالہ وہی شیون وہی آہ و فغاں کب تک

ذرا بیدار ہو اے شوقؔ آنکھیں کھول کر دیکھو
بہت غفلت کی نیندیں لے چکے خوابِ گراں کب تک

ردیف (ل)

سنہ ۱۸۸۷ء

ادائیں ہیں سب دل لبھانے کے قابل
ہر اک ڈھنگ ہے رنگ لانے کے قابل

نہ بیخودی کا پلا جام ساقی
یہ ساغر نہیں منہ لگانے کے قابل

گرایا بتوں نے بھی نظروں سے دل کو
نہ رکھا نہ رکھا زمانے کے قابل

مٹایا عبث سوزِ غم ہم نے رو کر
لگی یہ نہیں تھی بجھانے کے قابل

کمی سوزِ پنہاں میں ہونے نہ پائے
دلِ سوختہ ہے جلانے کے قابل

انہیں شوق کی یاد آئے نہ آئے
کہ یہ نام ہے بھول جانے کے قابل

ردیف (م)

سنہ ۱۹۳۹ء

بچھڑے ہیں کب سے قافلۂ رفتگاں سے ہم
ملجائیں گے کبھی نہ کبھی کارواں سے ہم

رہ رہ کے پوچھتے ہیں یہی باغباں سے ہم
لیجائیں چار تنکے کہاں آشیاں سے ہم

مجبور کس قدر ہیں دلِ بدگماں سے ہم
دیکھے کوئی کہ چپ ہیں کھڑے بے زباں سے ہم

اللہ ری عروجِ تخیل کے حوصلے
چل کر مکاں سے بڑھ گئے پیچھے لامکاں سے ہم

بادِ خزاں نے رنگ چمن کیا اڑا دیا
آخر کو نکلے خاک بسر بوستاں سے ہم

کس منھ سے ہاتھ اٹھائیں دعائیں ہیں بے اثر
پھر بھی ہے دل میں چھیڑ کریں آسماں سے ہم

وہ مے پلائی ساقی نے ہیں جس سے ہوش گم
جاگیں نہ جاگیں دیکھئے خوابِ گراں سے ہم

وہ سرزمیں کہاں کہ نہ ہو گردشِ فلک
ممکن نہیں کہ بچ کے رہیں آسماں سے ہم

آخر جنوں میں مل گئیں دامن کی دھجیاں
لے آئے اُن کو وادیٔ وحشت نشاں سے ہم

کم مائیگی میں نا رہی عجز و نیاز پر
اب کیا اٹھائیں سر کو تری آستاں سے ہم

کیسی چمک کہاں کی کھٹک اُف ری بے حسی
ہیں مست ذوقِ لذتِ دردِ نہاں سے ہم

مجبور دل تھا حکم قضا و قدر سے شوقؔ
اب کیا بتائیں آئے یہاں پھر کہاں سے ہم

ردیف (ن)

سنہ ۱۹۱۸ء

لبِ خاموش تو کب شکوۂ بیداد کرتے ہیں
دہانِ زخم اے قاتل مگر فریاد کرتی ہیں

علو ئے حوصلہ دیکھے تو کوئی میری نالوں کا
خدا کی شان ہے جا کر کہاں فریاد کرتی ہیں

زمانہ ہو گیا بھولے ہوئے طرز فغاں ظالم
نہیں اب یاد یہ بھی کس طرح فریاد کرتی ہیں

تڑپنا دیکھ کر تیرا وہ ہیں سہمے ہوئے اب تک
کہیں ایسی بھی حرکت اے دلِ ناشاد کرتے ہیں

شبِ فرقت نہیں آتی نہیں آتی نہیں آتی
اجل بھولی ہے ہم کو ہم اجل کو یاد کرتے ہیں

کبھی رکھتے تھے ہم بھی اک دلِ شوریدہ پہلو میں
عبث بھولی ہوئی باتوں کو اب تک یاد کرتے ہیں

نوا سنجانِ گلشن نالہ کش تو ہوں مرے آگے
ذرا میں بھی تو دیکھوں کس طرح فریاد کرتے ہیں

نشیمن سامنے ہے قوتِ پرواز زائل ہے
کہاں تک دیکھئے اب بال و پر امداد کرتے ہیں

لبِ شوقِ حزیں نا آشنائے شکوہ ہیں اب تک
ادھر تو دیکھئے یہ آپ کیا ارشاد کرتے ہیں

۱۹۱۹ء

شرمِ دامن گیر ہے آنکھوں میں آ سکتے نہیں
چشمِ دل وا ہے مگر اُن کو بلا سکتے نہیں!

اُن کے دل میں بدگمانی کوئی پیدا ہو نہ جائے
کیا کہیں دستِ دُعا بھی ہم اُٹھا سکتے نہیں

آہِ سرد و دیدۂ خونبار و بیتابیٔ دل
اُن کو اے دردِ محبت ہم چھپا سکتے نہیں

روک رکھا ہے ہجومِ آرزو نے راستہ
یاس و حرماں کو بھی ہم دل میں بلا سکتے نہیں

آؤ خلوت میں سمجھ لیں تا نہ ہو افشائے راز
جو لگا ہے روگ دل کو وہ جتا سکتے نہیں

یاد ہیں تسکیں فزا باتیں ہمیں صیاد کی
چھوٹ کر قیدِ قفس سے بھی بھلا سکتے نہیں

پردۂ غفلت اُٹھا تو بیخودی طاری ہوئی
شور بھی تیرے سودائی مچا سکتے نہیں

ناتوانی کا بُرا ہو جس نے ایسا کر دیا
اُس کے در تک اپنے قدموں سے بھی جا سکتے نہیں

درد ایسی شے نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ لے
اس لیے دل چیر کر تم کو دکھا سکتے نہیں

دردِ دل ہی ساتھ دیتا ہے شبِ فرقت میں شوق
جس کو ہمدردی ہو ایسی ہم بھلا سکتے نہیں

سنہ ۱۹۱۸ء

دل شکستہ ہوں مزہ کیا مری ترسانے میں
دے دے ساقی مجھے ٹوٹے ہوئے پیمانے میں

رند جامی سی ہوئے جلتے ہیں باہر ساقی
کیا مئے ہوش رُبا ہی ترے پیمانے میں

گرمیٔ حُسن سے ہی عشق کی گرمی بڑھ کر
کم نہیں سوز وفا شمع سے پروانے میں

لے چلو پھر دلِ بیتاب کو سمجھا کے وہیں
کیا تعجب ہی بہل جائے صنم خانے میں

جشنِ توبہ شکنی کیا ہے کسی کا ساقی
دھوم کیا آج مچی ہی ترے میخانے میں

وحشتِ دل نے مرا ساتھ نہ چھوڑا دم بھر
دو قدم مجھ سے بھی آگے تھی یہ ویرانے میں

دھجیاں جمع کئے نُوچ رہا ہے بیٹھا
آج یہ دُھن ہی سمائی تری دیوانے میں

شوق جاتے تو ہو سنبھلے ہوئے رہنا لیکن
سر کا سودا نہ بڑھے اور پری خانے میں

سنہ ۱۹۲۵ء

کس کا ہو کر یہ رہیگا دلِ بیمار کہاں
لے چلا ہی مجھے تو اے مرے غمخوار کہاں

جوشِ مستانہ میں کس کو یہ خبر رہتی ہے
گھر خدا کا ہی کہاں نرگسِ بیمار کہاں

جگر و دل سے مرے پوچھ لے ناوک افگن
نوکِ پیکاں ہی کہاں تیر کا سُوفار کہاں

ٹوٹی تسبیح لیے ڈھونڈھ رہا ہے زاہد
دانۂ سبحہ کہاں رشتۂ زنار کہاں

آئے میخانہ سے جب وہ پریں آنکھیں بھی کھلیں
کوئی دیکھے کہ ہوا آکے ہیں ہُشیار کہاں

مئے پرستی وہ گئی محفلِ رنداں نہ رہی
جامِ بلّور کہاں بادۂ گلنار کہاں

ڈھونڈھ بھی آئی اُسے دیر و حرم میں ہم تو
لے چلی ہی مجھے پھر حسرتِ دیدار کہاں

مر مٹے شوقؔ نہ اصنام پرستی چھوٹی
رائیگاں بھی جو ہوئی عمر تو بیکار کہاں

۱۹۳۵ء

نہ پڑے جام پہ اُن کی نگہِ ناز کہیں
اور بدمست نہ ہو چشمِ فسوں ساز کہیں

ہیں حدیں عشق و محبت کی ازل اور ابد
انتہا اُن کی کہیں اور نہ آغاز کہیں

دیکھ لوں جا کے میں اک بار نشیمن اپنا
اتنی آ جائے مجھے قوتِ پرواز کہیں

کچی کلیاں ہیں ابھی اور ہے بدظن صیّاد
یہ نہ سمجھے کہ میں ہوں قابلِ پرواز کہیں

ہر محفل بھی اشاروں میں ہی باتیں کرتی
چوکتی کب ہے تری چشمِ سخن ساز کہیں

ڈھونڈھنے سے بھی نشیمن نہ ملے گا مجھکو
ہو بھی جاؤں میں اگر قابلِ پرواز کہیں

مرنے جینے کا بھی اب ٹھیک ٹھکانا نہ رہا
تیغِ ابرو ہے کہیں ہونٹوں کا اعجاز کہیں

ایک دو دشمنِ دل ہوں تو بچا لوں اس کو
چشمِ پرفن ہے کہیں، عشوۂ انداز کہیں

سامنے تیرِ نظر کے ہے مرا طائرِ دل
یہ نشانہ نہ خطا ہو قدر انداز کہیں

دلِ بیکس کا نہ تھا کوئی شریکِ شبِ غم
چھان مارا نہ ملا ایک بھی دمساز کہیں

بھول کر راہِ حرم دیر میں آ نکلے شوقؔ
ہوتے ایسے بھی ہیں سامانِ خدا ساز کہیں

سنہ ۱۹۲۵ء

سفاک کے ہی شوق سمایا ہوا سر میں
بچپن ہی سے تلوار لگا لی ہے کمر میں

ڈھونڈھے گا کہاں پھر دلِ مجروح کسی کا
چھپ چھپ کے اگر رہ گیا پیکان جگر میں

دونوں کو رضامند کرے ایک ہی ناوک
سوفار رہے دل میں تو ہو پیکان جگر میں

بیتابیِ دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتی
رہ رہ کے کوئی چٹکیاں لیتا ہے جگر میں

کیا جانئے کیا رنگ زمانہ میں دکھائے
نالہ مرا ڈوبا ہوا جاتا ہے اثر میں

آنکھوں میں کھپی جاتی ہیں شرمیلی نگاہیں
یہ شوخ ادائیں تری رہتی ہیں نظر میں

برباد دعائیں بھی نہ آہوں کی طرح ہوں
یارب تو جگہ دے انہیں دامانِ اثر میں

اچھا ہی جو ارمانوں کا ہو خونِ شبِ وعدہ
وسعت نظر آتی نہیں دامانِ سحر میں

اے چرخ حذر چاہیئے مجھ سوختہ جاں سے
آتش ہی نہاں نالۂ پنہاں کے اثر میں

اے شوق ذرا چشمِ بصیرت سے تو دیکھو
سب کچھ ہی بھرا وسعتِ دامانِ نظر میں

سنہ ۱۹۳۰ء

ناوکِ ناز بھی آ آ کے خطا کرتے ہیں
بےرخی دل سے یہ کیوں تیر قضا کرتے ہیں

کیا قسم کھا کے بھی پھر آپ جفا کرتے ہیں
ناسمجھ بن کے بھلا آپ یہ کیا کرتے ہیں

سنیئے تو آپ کو کیا لوگ کہا کرتے ہیں
ہنس کے کہتے ہیں کہ ہاں ہم بھی سنا کرتے ہیں

دلِ پُر درد کی ڈر تا ہوں نہ کھل جائے زباں
چھیڑتے ہیں اسے یہ آپ بُرا کرتے ہیں

کسی بے دل سے کہیں مل کے ذرا پوچھو تو
چھین لینا ہی کوئی دل کو تو کیا کرتے ہیں

قبل از وحشتِ دل دستِ جنوں کی خاطر
دھجیاں بیٹھ کے دامن کی سیا کرتے ہیں

ہے یہی اک اُن کی ادا جان لیے لیتی ہے
تیغ تو ہاتھ میں ہے اور حیا کرتے ہیں

نیستی ہستی ہے اس رہ گزرِ عالم میں
مثلِ نقشِ کفِ پا بن کے مٹا کرتے ہیں

بس بس اے دل تیری اس ضد سے تو ہم ہار گئے
کوئی سمجھائے تو اس کا بھی کہا کرتے ہیں

کیسی زندانیوں نے دھوم مچا رکھی ہے
آپ کیا قیدیٔ گیسو کو رہا کرتے ہیں

کوئی خوبی دلِ مرحوم میں دیکھی تو نہ تھی
لوگ اب تک اُسے کیوں یاد کیا کرتے ہیں

ہم کو اپنے ستم و جور کا شایق پا کر
مشقِ اندازِ تغافل وہ سوا کرتے ہیں

حضرتِ **شوق** کی وحشت کی تو حالت یہ ہے
کبھی نالاں کبھی خاموش رہا کرتے ہیں

۱۹۱۸ء

ابھی وہ دن مجھے آئے ہوئے گزرے تھے گلشن میں
لگا دی باغباں نے آگ خود میرے نشیمن میں

مبارک باد دیوانو! ہوا سرسبز ویرانہ
بہارِ پُر فضا جلوہ فگن ہے دشت و گلشن میں

اُڑا دیں دھجیاں وحشت نے اے دستِ جنوں کیا کیا
نظر آتا نہیں اک تار بھی صحرا کے دامن میں

بہار آخر ہوئی آئی خزاں رنگِ چمن بدلا
مجھے تو خاک اُڑتی اب نظر آتی ہے گلشن میں

یہ خونِ کشتگانِ عشق کیا کیا رنگ لایا ہے
ہے دھبہ دامنِ قاتل پہ جوہر تیغِ آہن میں

دلِ دیوانہ کو اب دُھن بندھی ہے ہو کے میداں کی
بہلتا ہے نہ صحرا میں نہ جی لگتا ہے گلشن میں

کسی پہلو فنا کے بعد بھی راحت نہیں ممکن
کہ دل کے ساتھ ساری حسرتیں ہیں دفن مدفن میں

مرے زخمِ جگر تارِ نفس سے سل نہیں سکتے
رفوائے بخیہ گر کیا کر سکے گا چاکِ دامن میں

جو ہو برباد کیا برباد کرنا اُس کا اے صیاد
کہ دو تنکے بھی اب باقی نہیں شاخِ نشیمن میں

مجھے صیاد کی نظروں سے بچنا غیر ممکن تھا
نگاہیں روبرو تھیں جب کھلیں آنکھیں نشیمن میں

قیامت ہے نظر ملتے ہی دل کو شوق کھو بیٹھے
بلا کا سحر تھا جادو بھرا تھا چشمِ پرفن میں

سنہ ۱۹۱۹ء

ملتا نہیں ہے اب تو کوئی چارہ گر کہیں
کچھ اور رنگ لائے نہ دردِ جگر کہیں

دلِ مضطرب کہیں ہے نہاں ہے جگر کہیں
ایسے ہیں چوک جائے نہ تیرِ نظر کہیں

کہتی ہے یہ تراوشِ خونابۂ جگر
گھر اپنا کر چکی ہے کسی کی نظر کہیں

اُس آہِ نارسا نے تو مجبور کر دیا
کچھ کر دکھاتے ہم بھی جو ملتا اثر کہیں

جاتے ہیں بزمِ یار میں ضبطِ فغاں کیے
عزت ڈبو نہ دیجیو اے چشمِ تر کہیں

مایوس و ہوش باختہ واپس ہوا ہے کیوں
کچھ تو زباں سے اپنی کہہ نامہ بر کہیں

افشائے رازِ عشق پہ جھنجھلا رہے ہیں وہ
مجھ سے بگڑ کے کہتے ہیں کمبخت مر کہیں

حسرت نکلتی کچھ نگہِ واپسیں کی بھی
آجاتے دیکھنے سرِ بالیں اگر کہیں

مجھ سے مریضِ ہجر کا کیا چارہ گر علاج
اب کیا اُمید ہے کہ یہ لے لے سحر کہیں

کیوں شوق سے ہے تم کو کدورت بتاؤ تو
دیکھو ملے گا تم کو نہ ایسا بشر کہیں

سنہ ۱۹۲۳ء

دل ہے اُن کا۔ غبار ہم بھی ہیں
اچھے آئینہ دار ہم بھی ہیں

دلِ ناداں کو کون سمجھائے
اس میں بے اختیار ہم بھی ہیں

تربتیں کہہ رہی ہیں۔ حسرت سے
اِک مٹی یادگار ہم بھی ہیں

اے فلک دیکھ کر ستم کرنا
بندۂ کردگار ہم بھی ہیں

کہئے کہئے جو دل میں آیا ہے
قابلِ اعتبار۔ ہم بھی ہیں

اب بھی آجائے کوئی بالیں پر
دیکھئے انتظار ہم بھی ہیں

جا ہی پہونچیں گے اپنی منزل تک
گرچہ زار و نزار۔ ہم بھی ہیں

بارگاہِ جناب باری میں
بندۂ شرمسار ہم بھی ہیں

کوئے قاتل کے دیکھنے کے لئے
کس قدر بے قرار ہم بھی ہیں

اُٹھ کے کہتے ہیں نقشِ پا اُس کے
فتنۂ روزگار ہم بھی ہیں

چلنے والو چلو تو آؤ چلیں
عازمِ کوئے یار ہم بھی ہیں

شوق ہم سے کہاں ہیں متوالے
بیخود و ہوشیار ہم بھی ہیں

۱۹۲۱ء

رحم اُس پر چاہیے جو جور کے قابل نہیں — کاش اتنی مان لیتے بیوفا یہ دل نہیں
پائے استقلال ہو تو ہے تلاشِ یار سہل — اضطرابِ دل گیا جب پھر تو کچھ مشکل نہیں
فیضِ شمشیرِ ادا ہے عام ساری خلق میں — کونسا دل ہے کہ جو زخمی نہیں بسمل نہیں
دیکھیں کیونکر ہم گنہ گاروں کا بیڑا پار ہو — بحرِ عصیاں میں نظر آتا کہیں ساحل نہیں
عالمِ غربت میں متوالوں کی ہو کیسے بسر — ساغر و مینا نہیں ساقی نہیں محفل نہیں
چارہ گر ہے سرنگوں بیمار بھی ہے دم بخود — ہم ہوں اب سعیٔ لاحاصل سے کچھ حاصل نہیں

بھول بیٹھا ہے خدا کو بھی بتوں کی یاد میں
سچ یہ ہے دنیا میں کوئی شوق سا غافل نہیں

۱۹۲۲ء

بیہوش و دور میں لب ساغر سے کیا کہیں — شرما رہے ہیں ساقیٔ خود سر سے کیا کہیں
چوٹوں سے چور چور ہے زخموں سے ہے ہرا — مجروح دل ہے سینہ میں دلبر سے کیا کہیں
آخر نہ ہو سکا رگِ گردن کا امتحان — باقی نہیں ہے دم دمِ خنجر سے کیا کہیں
عجلت نے اُس کی یار کا برہم کیا مزاج — یہ تو نے کیا کیا دلِ مضطر سے کیا کہیں
اُف کس غضب کا وار تھا اے ناوکِ نگاہ — بسمل دل و جگر ہیں ستمگر سے کیا کہیں
دل جانتا ہے جیسے ہو تم بانیٔ جفا — کچھ کم نہیں ہو فتنۂ محشر سے کیا کہیں
اک جام دور میں ہمیں ملتا نہیں نصیب — محروم ہم بادہ۔ ساقیٔ خود سر سے کیا کہیں

شکوہ ہے باغباں کا نہ صیاد کا گلہ
رخصت ہوئی بہار، مقدر سے کیا کہیں

سر پر چلے ہیں لے کے تو پشتارۂ گناہ
اب سوچتے ہیں خالقِ اکبر سے کیا کہیں

اے شوقؔ رہیے معتقدِ ذاتِ لایزال
سنتا ہی جو نہ ہو بُت کافر سے کیا کہیں

۱۹۲۶ء

عشق کی جب سوزشیں بڑھ بڑھ کے پنہاں ہو گئیں
حسن کی سرگرمیاں کیا کیا نمایاں ہو گئیں

ترچھی نظریں شوخ کی پیہم رگِ جاں ہو گئیں
دل سے جب گزریں دوائے دردِ پنہاں ہو گئیں

وحشتیں کہتی تھیں کیسی پاؤں پھیلائیں گے ہم
دیکھتے ہی وسعتِ دل وہ بھی حیراں ہو گئیں

تھی جمعیت جبکہ آہیں سینہ میں محفوظ تھیں
گوشۂ دل سے نکلتے ہی پریشاں ہو گئیں

دلفریبی ہائے حسنِ شوخ کیا سفاک تھیں
آتے ہی پیشِ نظر وہ دشمنِ جاں ہو گئیں

وہ امیدیں جن سے وابستہ تھا لطفِ زندگی
وائے ناکامی جنوں میں نذرِ عرفاں ہو گئیں

خواب میں تھیں جلوہ آرا جو خیالی صورتیں!
آنکھ کھلتے ہی وہ سب نظروں سے پنہاں ہو گئیں

ہم نے جانا تھا کہ رونا عاشقوں کا کھیل ہے
آنسوؤں کی چند بوندیں موجِ طوفاں ہو گئیں

کچھ نہ پوچھو کیا بتائیں آرزوئیں کیا ہوئیں!
عشق کے ہاتھوں ہیں یاس و حرماں ہو گئیں

وادیٔ وحشت میں مجھ پر مشکلیں جتنی پڑیں
اے جنوں تیری بدولت سب وہ آساں ہو گئیں

اب نظر آتے ہیں وہ جلسے نہ یارانِ وطن
شوقؔ کیا کیا مجلسیں نظروں سے پنہاں ہو گئیں

سنہ ۱۹۳۶ء

آتشِ حسن بھی نہاں جلوۂ بے نیاز میں
عشق کو کیا مزا ملا سوزشِ دل گداز میں

عرض کریں گے حالِ دل پردۂ غم کے ساز میں
عشق کے راز کا بیان آج کریں گے راز میں

سننے لگے ہیں جی سے اب دردِ جگر کا ماجرا
کیسی بھری تھیں گرمیاں نالۂ دلگداز میں

دیر و حرم کو جائے کون اُن سے نہیں غرض ہمیں
دیکھیں گے ہم جمالِ یار سجدۂ بے نیاز میں

آیا ہے در پہ دور سے ایک گدا لئے بینوا
سُن تو لے عرضِ ناتواں درد بھرے نیاز میں

کچھ نہ دوا سے ہو سکی جان بری مریضِ غم
بے اثری ملی رہی نسخۂ چارہ ساز میں

جلتی ہے شمع بزم میں - گل ہے چمن چمن چمن
دونوں ہوئے ہیں بہرہ ور عشق کے سوز و ساز میں

دیکھئے دل سا کیا ہو حشر کچھ بھی نہ کہتے بن پڑی
کوئی چھپا کے لے گیا اپنی نگاہِ ناز میں

شوقؔ بتوں کا سنگِ در آپ بنا اور پارسا
سر نہ جھکائے عمر بھر سجدۂ بے نیاز میں

سنہ ۱۹۴۳ء

دکھڑے یہ آج سنئے کسی بے زباں کے ہیں
کچھ ٹکڑے اُس کی بھولی ہوئی داستاں کے ہیں

کیوں ان بتوں سے زیرِ فلک دب کے ہم رہیں
یہ رہنے والے دیر کے ہم لامکاں کے ہیں

دیکھو میں چپ ہوں شوق سے پامال تم کرو
ہاں ہاں یہ ٹکڑے میرے دلِ بے زباں کے ہیں

محرومئ نصیب کو لے جائیں اب کہاں
آخر گدا تو ہم بھی ترے آستاں کے ہیں

مدفن پہ پھول دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے
کس سے یہ پوچھتے کہ یہ کس بوستاں کے ہیں

اہلِ عدم کے نقشِ قدم پائیں کس طرح　　ناپید زیرِ خاک نشانِ رفتگاں کے ہیں

آنسو تو بہہ گئے رہے دامن پہ لختِ دل　　پس ماندہ یہ غریب اُسی کارواں کے ہیں

ہونٹوں پہ آہِ آتشیں آنکھوں میں اشکِ گرم　　سارے کرشمے یہ مرے سوزِ نہاں کے ہیں

زینت اُنھیں سے دامنِ صد پارہ کی ہے شوق

دھبّے یہ ڈالے سب مژۂ خونچکاں کے ہیں

۱۹۲۳ء

محبت میں ستم دیدہ ہوں پامالِ جفا میں ہوں　　دلِ حسرت زدہ کی ایک آہِ نارسا میں ہوں

بیانِ نالۂ دل ہے کہ بانگِ بے درا میں ہوں　　جسے سنتا نہیں کوئی وہ خالی صدا میں ہوں

حقیقت ہستیٔ موہوم کی میں کیا کہوں ہمدم　　کفِ معشوق کا اڑتا ہوا رنگِ حنا میں ہوں

بہت پچھتاؤ گے لیکر دلِ پُر دردِ پُر ارماں　　دوا کیجے تو کہتا ہے کہ دردِ لادوا میں ہوں

نہ پوچھو اے اسیرانِ چمن میں کون ہوں کیا ہوں　　غرض جو کچھ ہوں اک سازِ شکستہ کی صدا میں ہوں

بصد منت بڑھا جب دستِ شوق اُس کے اٹھانے کو　　نقابِ رخ یہ بول اُٹھی کہ دربانِ حیا میں ہوں

نگاہِ فتنہ ساماں یہ دلِ پُرخوں سے کہتی ہے　　ادائے فتنہ زا ہوں اور تیرِ بے خطا میں ہوں

دلِ آزاد کو میں اُن کی محفل سے اُٹھا لاتا

مگر اے شوق مجبوری ہے پابندِ وفا میں ہوں

۱۹۲۳ء

جامِ وحدت کا ابھی تک کوئی سرشار نہیں　　ہوش کچھ کچھ ہے مگر دیدۂ بیدار نہیں

جس نے بیداد پہ بیداد سہی تھی اِک عمر — آج دنیا میں کوئی اُس کا طلبگار نہیں

حالتِ دردِ محبت کہیں کیا بیخودِ عشق — یہ ہی وہ راز کہ جو قابلِ اظہار نہیں

آپ جس دل کی ثنا کرتے تھے گاہے گاہے — وائے قسمت کہ وہ اب قابلِ گفتار نہیں

چاک اب کس کو کرے ہائے مرا دستِ جنوں — پیرہن کیسا تنِ زار میں اک تار نہیں

اے فلک دیکھ مری آہ سے بچ کر رہنا — لامکاں تک اُسے جانا کوئی دشوار نہیں

اضطراب اے دلِ بیتاب عبث ہے تجھکو — اُن کی مست آنکھوں کا غافل ابھی ہشیار نہیں

تیرِ مژگاں میں بھلا زور کہاں سے آئے — جتنے آئے ہیں کسی میں پر و سوفار نہیں

شوق اب شیخ و برہمن سے تعلق نہ رہا
مجھ کو دل بستگیٔ سبحہ و زنار نہیں

سنہ ۱۹۲۵ء

میں صدہا بھیس میں آیا گیا ہوں — نکالا اور پھر لایا گیا ہوں

وہ بزمِ قدس تھی خالی ز اغیار — جہاں سے جبکہ اُٹھوایا گیا ہوں

میں حیراں ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں — اَجل کہتی ہے بلوایا گیا ہوں

مری شاہد ہے میری بے زُبانی — عدم سے بے خبر لایا گیا ہوں

سماں اب تک وہی پیشِ نظر ہے — میں کس محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

رہا جب مدتوں دیر و حرم میں — سمجھ آئی کہ بھٹکایا گیا ہوں

عدم کی یاد نے پہروں رُلایا — یہاں آ کر میں منوایا گیا ہوں

نکلنا دہر کے پھندوں سے مشکل
کہاں لاکر میں اُلجھایا گیا ہوں
کسی کے جلوۂ مستانہ سے شوق
نہ یہہ کہنا کہ بہکایا گیا ہوں

سنہ ۱۹۲۵ع

کچھ بھی ہو بھولی ہوئی یادِ خدا پیدا کروں
شوق پھر کچھ دیدہ و دل میں ضیا پیدا کروں
جو دلِ مضطر کو محویت میں رکھے تا ابد
اے جنوں میں سازِ دل سے وہ صدا پیدا کروں
اِن بتوں میں ہے کمالِ صنعِ صورت آفریں
دیکھ کر اے دل انہیں یادِ خدا پیدا کروں
ایسے ظالم کو میں دردِ دل دکھاؤں کس طرح
جو ہو پنہاں اُس کو کیوں کر آشکارا پیدا کروں
ہمصفیرانِ چمن ہیں سب گرفتارِ قفس
اب کہاں سے کوئی اپنا ہم نوا پیدا کروں
آستاں بوسی تو مدت تک بتوں کی ہو چکی
اپنا کعبہ اپنا معبد اک نیا پیدا کروں
کس طرح آئے تمہیں میری محبت کا یقیں
جو بناؤ تم وہی طرزِ وفا پیدا کروں
دل ہی ہے پر غم یاس غالب آہ و نالہ نارسا
ہائے کس منہ سے میں تاثیرِ دعا پیدا کروں
نالۂ شبگیر نے تو شوق رسوا کر دیا
گوش زد ہو جائے وہ آہِ رسا پیدا کروں

سنہ ۱۹۲۷ع

مل گئی آہِ بے اثر زمزمۂ ہزار میں
درد بھی اب نہیں رہا نالۂ دلفگار میں
ضبطِ فغاں ہو کس طرح مجھ سے فراقِ یار میں
دیکھیے کیا بپا ہو حشر دل نہیں اختیار میں

پوچھتے کیا ہو ہمدمو جوشِ جنوں کا ماجرا
ہوش کہاں جو باخبر ہو۔ گزرا جو بزمِ یار میں

تم نے مجھے مٹا دیا تم نے مجھے بھلا دیا
شکوہ کروں گا میں بھی ایک نہیں ہزار میں

پوچھ نہ کچھ بھی ہمنشیں حالِ منِ حزیں ہے
کنجِ قفس میں کیا کہوں کیسی کٹی بہار میں

اُف رے ہوائے فصلِ گل اُف رے وفورِ جامِ مُل
اُف رے میانِ جزو و کل فرق نہ تھا بہار میں

کس کی نظر لگی ہے شوق کس کی یہ دل میں جا ہے
کس کے لیے ہو منتظر کس کے ہو انتظار میں

۱۹۲۸ء

جب یہ سمجھ لیا کہ محبت میں ہم نہیں
پھر دردِ عشق موت بھی آئے تو غم نہیں

کیا فکرِ آشیاں کی اسیرِ قفس کو ہو
بجلی گرے کہ آگ لگے اُس کو غم نہیں

ساقی کچھ ایسا بے سروساماں نہیں ہوں میں
جام سنبھال اپنا کم از جامِ جم نہیں

پیرِ مغاں کے در کا گدا ہوں میں ساقیا
چُلّو سے ہوتے کچھ ہوسِ جامِ جم نہیں

پینے میں ہچکچاتا ہے اے شیخ کس لیے
بادہ یہ روح بخش ہے کمبخت سم نہیں

اس پر بھی اک جہاں ہے قتیلِ ادائے ناز
طُرفہ یہ ہے کہ ڈاب میں تیغِ دو دم نہیں

دل کو مسوس بیٹھے ہیں ضبطِ فغاں کیے
آہیں نہ لب پہ آنسوؤں سے چشم نم نہیں

مُلکِ عدم کو قافلے جاتے ہیں اَن گنت
ظاہر مگر کسی کا نشانِ قدم نہیں

روتے ہوئے ہم آئے تھے ہنستے ہوئے چلے
جینے کی کیا خوشی تھی جو مرنے کا غم نہیں

اے جانے والو ساتھ نہ چھوڑو غریب کا
وہ روشناس جادۂ مُلکِ عدم نہیں

دل بستگی ہو شوق کی کعبہ میں کس طرح
وہ میکدہ نہیں ہے وہ بیت الصنم نہیں

١٩٣٠ء

جو محبانِ وفا ہیں وہ وفا کرتے ہیں
کچھ غرض اس سے نہیں کون جفا کرتے ہیں

خوگرِ درد ہیں سب کچھ وہ سہا کرتے ہیں
دشمنوں سے نہیں مطلب کہ وہ کیا کرتے ہیں

ہم جگر تھام کے جب آہِ رسا کرتے ہیں
اک قیامت میں قیامت ہی بپا کرتے ہیں

چارہ گر کا ہو بھلا کون رہینِ منت
ہم تو خود اپنے ہی زخموں کو سیا کرتے ہیں

سازِ ہو عیش کا یا سوزِ مصیبت و ستم
اب تو ہر حال میں ہم شکر ادا کرتے ہیں

آپ شرما گئے کیوں دیکھ کے رقصِ بسمل
کیا کہیں تیرِ نظر جل کے خطا کرتے ہیں

آتشِ عشقِ وطن رکھتے ہیں دل میں روشن
اپنی ہی آگ میں جل جل کے بجھا کرتے ہیں

ہر حبابِ لبِ جو جلوہ گہہ ہستی ہے
نقش بن بن کے زمانہ سے مٹا کرتے ہیں

شوق سا بندۂ آزاد زمانہ میں کہاں
آج سنتے ہیں کہ وہ یادِ خدا کرتے ہیں

١٩٢٧ء

دل میں ہے کون جلوہ گر دل کو مگر خبر نہیں
پیشِ نظر ہے کیا تری خاک تری نظر نہیں

پھولے پھلے چمن چمن ایسا کوئی شجر نہیں
شاخ ہوئی نہ بارور دیکھے کبھی ثمر نہیں

کس سے کہوں میں کیا ہوا کس نے مجھے مٹا دیا
میری نوا میں بھی اب درد نہیں اثر نہیں

آئے تھے کس مقام سے جاتے ہیں دیکھیے کدھر — کس نے کیا ہے اب طلب اس کی بھی کچھ خبر نہیں

جاتے ہیں ہم بھی بتکدے جلوے بتوں کے دیکھنے — کعبہ کو جائیں کیوں عبث اپنا وہاں گزر نہیں

ہم بھی ہیں رہروِ عدم چلتے ہو تو چلے چلو — آؤ بھلا اے مسافرو ایسا کڑا سفر نہیں

یومِ فراق ہو گیا شامِ جدائی بھی گئی — کیسے کٹے گی رات وہ جس کی کبھی سحر نہیں

ہونا تھا جو وہ ہو گیا اُس کا گلہ نہیں ذرا — دل پہ جو کچھ گزرتی ہے اُس کی تمہیں خبر نہیں

کیا کریں عرضِ مدعا حسن حسیں ہے بے وفا
شوقؔ جفائے دہر سے دل کو مگر مفر نہیں

١٩٣٢ء

حدِ احساسِ گنہ پردۂ رحمت میں نہیں — جو گنہ ہوں میں مزہ ہے وہ ندامت میں نہیں

ہم سے ناکامِ محبت رہے محرومِ وصال — ورنہ کیا بات ہے جو قبضۂ قدرت میں نہیں

شکوۂ جور عبث ایسی بھی کیا بیتابی — ضبط میں لطف جو آئے دل کی شکایت میں نہیں

بے خبر دیکھ تو بے رنگیٔ عالم کی فضا — جس سے زینت تھی وہی بزمِ محبت میں نہیں

کس بنا پر تجھے ہم بانیٔ بیداد کہیں — کوئی جدت بھی تو ظالم تری عادت میں نہیں

جب چلے سوئے عدم دل میں تھا دھڑکا کیا کیا — آنکھ کھلتے ہی یہ دیکھا کوئی تربت میں نہیں

ہیں وہ خاموش نگاہیں بھی ہیں نیچی اُن کی — کون سی بات ہے پنہاں جو ندامت میں نہیں

شوخ چشمی تری کہتی ہے نظربازوں سے — پردۂ رازِ مجاز اور حقیقت میں نہیں

دیکھنے کے لیے ہم دور سے آئے تھے مگر — ایک دیوانہ بھی دیوانِ قیامت میں نہیں

مست ہو جانے کو ہیں اُن کی نگاہیں کافی
حاجتِ بادۂ و خم بزمِ حقیقت میں نہیں

ضبط کہتے ہیں کسے صبر و تحمل کیسا
صبر کا نام بھی کمبخت طبیعت میں نہیں

سنہ ۱۹۳۰ء

قابلِ ذکرِ جنوں عشق کی روداد نہیں
مختصر یہ ہی کہ کچھ بھی تو مجھے یاد نہیں

گلۂ جور و جفا شکوۂ بیداد نہیں
لبِ خاموش مرے خوگرِ فریاد نہیں

کس لیئے دستِ ستم جور و جفا سے کھینچا
جتنا ہی صبر مجھے اتنی بھی بیداد نہیں

آشیاں سامنے آنکھوں کے ہی میں ہوں بےبس
بال و پر بھی تو مرے قابلِ امداد نہیں

سوزِ پنہاں سے جلی یا غمِ ہجراں کو سہی
یہ مرا دل ہی کوئی پارۂ فولاد نہیں

صبر کر صبر ذرا قیدیِ زندانِ جنوں
تو وہ مجرم ہی کہ جس کی کوئی میعاد نہیں

ہم سے قسّامِ ازل نے تو کہا تھا کیا کچھ
وائے دیوانگیِ شوق کہ اب یاد نہیں

شکر ہی مجھکو نہیں صبر و سکوں کی حاجت
لطفِ ہستی ہی سے بےبہرہ جو ناشاد نہیں

آہ و زاری ہی نہ شیون نہ فغاں و نالہ
آج کیا ہی جو کہیں عالمِ فریاد نہیں

ہو کا عالم نظر آتا ہی بیابانِ جنوں
ایسا بھولا ہوں کہ اب تک مجھے گھر یاد نہیں

جستجوئے دلِ گم گشتہ میں گزری اک عمر
کب وہ پہلو سے گیا شوق یہ کچھ یاد نہیں

۱۹۳۱ء

الفتِ حُبِّ وطن سے تو گرفتاروں میں ہوں
مختصر یہ ہے کہ ناکردہ گنہگاروں میں ہوں

بے زبانی کے تصدّق کر رہا ہوں جان و دل
کچھ بھی ہو لیکن وطن کے نازبرداروں میں ہوں

جاگزیں کب سے ہے دل میں جذبۂ حُبِّ وطن
دوستو روزِ ازل سے ہی میں وفاداروں میں ہوں

دل میں ہے جوشِ ولا اور لب پہ ہے ذکرِ وطن
گو کہ ہوں لاچار لیکن ہرزہ گفتاروں میں ہوں

ابتدا ہی سے ہے دل مستِ مئے حُبِّ وطن
انتہائے بیخودی یہ ہے کہ ہشیاروں میں ہوں

اَلفراق اے داغِ فرقت - المدد حُبِّ وطن
دور افتادۂ وطن کے ہیں دل افگاروں میں ہوں

بادۂ حبِّ وطن مجھ کو پلا دے ساقیا
بن پیئے مدت ہوئی ہیں تیری میخواروں میں ہوں

جھپکیاں رہ رہ کے دل میں لیتی ہے یادِ وطن
تجھ سے گو ہوں دور پر تیری طلبگاروں میں ہوں

بختِ خفتہ نے جگایا جھپکیاں دے دے کے شوق
نیند کے ماتے نہ میں ہوں اور نہ ہشیاروں میں ہوں

۱۹۲۹ء

لبِ فریاد کا دمساز ہوں میں
اسی انجام کا آغاز ہوں میں

صفیرِ مرغِ بے پرواز ہوں میں
دلِ گم گشتہ کی آواز ہوں میں

تمنائے نشیمن بے بسی میں
شکستہ بال کی پرواز ہوں میں

نیاز و بے نیازی سے مجھے کام
گدائے بارگاہِ ناز ہوں میں

زمانے سے نہیں مجھ کو سروکار
زمانے میں کسی کا راز ہوں میں

خدا جانے کہ اس کا کیا ہو انجام
فریبِ عشق کی آواز ہوں میں

ازل سے حسن پر عاشق ہوں ای شوق
جہاں میں عشق کا آغاز ہوں میں

۱۹۳۲ء

قتیلِ طرزِ نگاہِ ستم شعار ہوں میں
فریب خوردۂ نیرنگ روزگار ہوں میں

اُڑا ہی رنگ بُرخِ اضطراب رہ رہ کر
یہ اک دلیل ہی بیّن کہ بے قرار ہوں میں

غضب ہی لغزشِ مستانہ ساقیا تیری
چھلک نہ جائے یہ ساغرِ امیدوار ہوں میں

نہ پاسِ ضبط کا یارا نہ تابِ آہ و فغاں
نکالوں کیسے زباں سے کہ دلفگار ہوں میں

نہ پوچھ مجھ سے یہ ناصح کہ عمر کیسے کٹی
خدا کا بندہ ہوں گو اک گناہگار ہوں میں

جسے سُنا ہی نہ تھا جی لگا کے تم نے کبھی
اُسی فسانہ کی تمہید اختصار ہوں میں

سمجھتا ہی نہیں کمبخت مانتا ہی نہیں
ہزار دل سے یہ کہتا ہوں غمگسار ہوں میں

ابھی تو چھوڑ نہ ای بیخودی شوق مجھے
بڑا مزہ ہی کہ مستی میں ہوشیار ہوں میں

خبر کسے ہی گریبانِ جیب و داماں کی
جنوں کے ہاتھوں سے کس کس کا پردہ دار ہوں میں

کہاں یہ ذوقِ نظر اور کہاں وہ جلوۂ حسن
یہ شوق ہی ہمہ تن چشمِ انتظار ہوں میں

وہ دل کہ جس کی وفا پہ مجھے بھروسا تھا
اُسی کے ہجر میں مدت سی سوگوار ہوں میں

خوشی نہ موسمِ گل کی نہ رنج فصلِ خزاں
وہ باغِ دہر میں سامانِ صد بہار ہوں میں

خود اپنے جور پہ نادم ہوئے ہیں وہ اے شوقؔ
تمھیں اب اُن سے یہ کہہ دو کہ شرمسار ہوں میں

سنہ ۱۹۳۲ء

سمجھا نہ خاک وسعتِ حدِّ نظر کو میں — آنکھوں سے پوچھتا ہوں تری رہگزر کو میں
تیرِ نگاہِ ناز نے کی کچھ خطا ضرور — تم پہلے دل میں ڈھونڈھ لو دیکھوں جگر کو میں
دل خندہ زن ہے گردشِ لیل و نہار پہ — روتا نہیں ہوں قسمتِ شام و سحر کو میں
ہمدم نہ پوچھ بزمِ شبینہ کی سرگزشت — رو رو دیا ہوں دیکھ کے شمعِ سحر کو میں
انجام کیا ہو دیکھیے دل کا فراق میں — رکھتا ہوں اُس کے پاس ہی سوزِ جگر کو میں
دیکھے تو کوئی رب بے سر و سامانیاں مری — جاتا ہوں چھوڑ کر یہیں زادِ سفر کو میں
پرسش جو عاصیوں کی ہوئی روزِ بازپرس — کہدوں گا صاف لایا تو ہوں چشمِ تر کو میں
میری طرح نہ یہ بھی تڑپنے لگیں کہیں — تھامے ہوئے ہوں ہاتھوں سے قلب و جگر کو میں
دیر و حرم نہ جانے کہاں پیچھے رہ گئے — بیٹھا ہوا ہوں سوچ میں جاؤں کدھر کو میں

منت پذیرِ دستِ جنوں ہوں ازل سے شوقؔ
کرتا ہوں چاک چاک بیاضِ سحر کو میں

سنہ ۱۹۲۷ء

ہے اک ہجومِ یاس دلِ بے قرار میں — لاکھوں ہیں حسرتیں نگہِ انتظار میں
مجبوریاں ہی لائیں عدم سے ہمیں یہاں — اب کیا کریں کہ کچھ بھی نہیں اختیار میں

رونے کا کچھ مزہ نہ تڑپنے کا کوئی لطف
آنکھیں نہ بس میں ہیں نہ دل اختیار میں

اے عندلیبِ زار نہ رو پھوٹ پھوٹ کر
کلیاں بھری ہیں دامنِ ابرِ بہار میں

جز حسرتِ وصال نہیں اور آرزو
خود آ کے دیکھ لو دلِ امیدوار میں

جور و جفا کی تو یہ تلافی بھی ہو گئی
سب کا جواب ہے نگہِ شرمسار میں

اے دردِ دل بتا تو کہ کب تک رہیگا تو
چھانٹا تجھی کو ہے ستمِ روزگار میں

کیسی کھٹک کہاں کی چمک اور کہاں کا درد
اب حس ہی کچھ نہیں ہے دلِ سوگوار میں

تر دامنی پہ اپنی نہ رو شوقؔ اس قدر
مہر و کرم ہے رحمتِ پروردگار میں

سنہ ۱۹۳۲ء

قفس میں ہم رہیں کب تک ہائے دیکھئے کب ہو
اجازت ہو تو مڑ کر سوئے گلشن اک فغاں کر لیں

ہمیں تو ایک ساغر بھی کہیں مانگے نہیں ملتا
چلو بھی میکدہ کو بیعتِ پیرِ مغاں کر لیں

کہاں کی ناصیہ سائی کہاں کی آستاں بوسی
وہی ہے خانۂ حق بیٹھ کر سجدہ جہاں کر لیں

خدائی کا ہے دعویٰ ان بتوں کو دیکھئے کیا ہو
ادھر بھی ایک سجدہ آؤ پھر امتحاں کر لیں

نوا سنجی گئی وہ اب صفیر و پر چھینے کیا ہو
کوئی عنواں بنا دو قصۂ غم کچھ بیاں کر لیں

مجالِ ضبط بھی تو اب جواب صاف دیتا ہے
اڑا جاتا ہے رنگِ رخ اسے کیونکر نہاں کر لیں

نہ ہے گلچیں کو ہمدردی نہ ہے برقِ تپاں ہو
چمن کیسا کہیں اب اور فکرِ آشیاں کر لیں

رہی جاتی ہے باقی اک خلش دل میں کہاں کہیں
چلو چلتے چلاتے یہ بھی سرفِ دشمناں کر لیں

بلا سے جان جائے یار رہے جھگڑا مٹے اے شوق
جو ہونا ہو سو ہو قاتل کا چل کر امتحاں کرلیں

۱۹۳۲ء

حریمِ ناز کہاں اور سرِ نیاز کہاں — کہاں کا سجدہ کسے ہوش ہے نماز کہاں
مجھے خبر ہی نہیں ہے حریمِ ناز کہاں — نیاز مند کہاں اور بے نیاز کہاں
پڑی ہے کیا اُسے حسرت زدوں میں آ نکلے — یہ میری بزم کہاں اور وہ محوِ ناز کہاں
یہ مانا حسنِ حقیقت عیاں مجاز میں ہے — مگر وہ جلوہ ہے اے چشمِ امتیاز کہاں
علاج کس کا کرے گا یہ پوچھنا کیا ہے — بتائیں کیا تجھے ہے دردِ چارہ ساز کہاں
کبھی تو ملتی تھی ہجر و وصال میں لذت — مگر بجھے ہوئے دل میں وہ سوز و ساز کہاں
دعائیں مانگتا ہے شیخ کیوں معاذ اللہ — خدا کا نام لے توبہ کا در ہے باز کہاں
بڑے مزے سے گزرتی ہے بادہ خواروں کی — بجز شراب خیالِ شبِ دراز کہاں

ملا وہ بیخودیٔ شوق میں مزا اے شوق
جنونِ عشق میں باقی ہے امتیاز کہاں

۱۹۳۲ء

آج گردش میں جو وہ نرگسِ مخمور نہیں — دور ہیں پیرِ مغاں شیشۂ دل چور نہیں
دل ستم سہنے میں عشاق کا مجبور نہیں — لب پہ اظہارِ شکایت ہو یہ دستور نہیں
اضطرابِ دلِ بیتاب الٰہی توبہ — جان دم بھر میں نکل جائے تو کچھ دور نہیں

باتوں ہی باتوں میں وہ لے گئی دزدیدہ نظر — آج پہلو میں ہمارے دلِ رنجور نہیں

لذّت افزائے خلش ہے ترا ناوک ظالم — سینے سے اس کا نکلنا مجھے منظور نہیں

دل کی آنکھوں سے نہ کیوں جلوۂ جاناں دیکھیں — خاک ہی خاک ہے اب کچھ بھی سرِ طور نہیں

کس کو امیدِ رسائی ہے درِ جاناں تک — جادۂ حسنِ تصوّر سے تو کچھ دور نہیں

ہم کو سجدہ سے غرض کعبہ و بت خانہ کیا — بندگی سے کوئی بندہ کہیں مجبور نہیں

ہم سے نیرنگئ عالم کی حقیقت پوچھو — کون ہشیار ہے ایسا کہ جو مخمور نہیں

حالِ ویرانئ مے خانہ کوئی کیا جانے — مے سرِ جوش سے ساغر کوئی معمور نہیں

جاں نثاروں کا ہوگیا حشر بروزِ محشر — اس کا کچھ تذکرۂ عشق میں مذکور نہیں

ہر بُنِ مو سے انا الحق کی صدا آتی ہے — دلِ ناشاد یہ آوازۂ منصور نہیں

ساقیا ایک ہی ہشیار ہے وہ مستِ ازل
رازِ میخانہ کوئی شوق سے مستور نہیں

۱۹۳۲ء

نقابِ رخ کو سب پردۂ زیبا سمجھتے ہیں — ہم اک سحرِ نظر نیرنگِ حیرت زا سمجھتے ہیں

دلِ پُر درد میں اے عشق کیا کم آرزوئیں ہیں — کہ ہم ہر آرزوئے دل کو اک دنیا سمجھتے ہیں

نہیں کچھ وائے ننگِ نامرادی اپنی عادت میں — وہ سودائی ہیں جو رسوائی کو سودا سمجھتے ہیں

فریبِ دید ہی پایا تماشا گاہِ عالم کو — نہ ہم گلشن سمجھتے ہیں نہ ہم صحرا سمجھتے ہیں

یہ کیا اعجاز ہے تیرا کہ اے نیرنگئ جلوہ — کبھی ہم تجھ کو پنہاں اور کبھی پیدا سمجھتے ہیں

کہاں وہ روئے روشن اور کہاں وہ تابِ نظارہ سمجھنے والے پھر بھی جلوہ رسوا سمجھتے ہیں
ذرا تسکین ہو جاتی ہے دل کو نالۂ غم سے قیامت ہے اُسے وہ شورشِ بیجا سمجھتے ہیں
جبینِ شوق کب تک اشتیاقِ آستاں بوسی
جہاں سر رکھ دیا ہم نے اُسے سجدہ سمجھتے ہیں

سنہ ۱۹۳۳ء

دل سا رہبر ساتھ جب چھوڑے تو کیوں بھٹکا کریں آستاں وہ کونسا ہے اب جہاں سجدہ کریں
ترکِ اُلفت کا طریقہ سوچتے ہیں کیا کریں جذبِ اُلفت ہی کو اپنے رہنما اپنا کریں
دیکھنے والوں کی آنکھوں سے چھپیں گے کس طرح ڈھونڈھ ہی لیں گی نگاہیں لاکھ وہ پردا کریں
خوب ہی بستی بسائی وحشیانِ عشق نے چین سے گورِ غریباں میں وہ اب سویا کریں
انتہائے شوق نے پہونچا دیا تا لامکاں لب پہ مہرِ خامشی ہے راز کیا افشا کریں
خفتگانِ خاک کو اتنا ہی سمجھا دے کوئی اس نئی جامے کو اپنے اب وہ میلا کریں
دیدہ ہائے شوق وا ہیں کون ہے اُن کا حریف حُسنِ بے پردہ کا جلوہ شوق سے دیکھا کریں
دل کی ماہیت بدل جائے کچھ ایسی اب تو شوق
ساغرِ مے سامنے ہو اور ہم توبہ کریں

سنہ ۱۹۳۳ء

دل کے پیمانہ میں کیا بادۂ سرجوش نہیں ساقیا کیسی یہ کمی ہے کوئی مدہوش نہیں
پی تو لیتا ہوں کبھی بزم میں بلا نوش نہیں رند خوش باش تو ہوں خمکدہ بردوش نہیں

خم کے خم ہم نے لنڈھائے اسی میخانہ میں — حیف اُس دور کا باقی کوئی مینوش نہیں
نالہ و آہ بھی جاتے ہوئے رُک جاتے ہیں — ایسی ان بن ہے کہ تاثیر ہم آغوش نہیں
ناوکِ ناز کو آتے ہوئے دیکھا تھا مگر — دل سے کیا کہہ گیا چپکے سے یہ کچھ ہوش نہیں
میکشانِ مئے گلرنگ ہیں ہشیار مگر — ہیں وہ سرمستِ ازل ہوں جسے کچھ ہوش نہیں

منزلِ عشق سے کب بڑھ گئے آگے اے شوق
بیخودی کا ہے یہ عالم ہمیں کچھ ہوش نہیں.

سنہ ۱۹۳۶ء

دل اب یہ کہہ رہا ہے کہ دردِ نہاں نہیں — تیرِ نظر کا وار گیا رائیگاں نہیں
دل بستگیِ عالمِ امکاں کو دیکھکر — حیران ہوں کہ جینِ تہِ آسماں نہیں
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے یارانِ رفتہ کو — کچھ ایسے گم ہوئے ہیں کہ ملتا نشاں نہیں
حسرت زدہ اسیروں کو صیاد! دیکھکر — کنجِ قفس میں یاد مجھے آشیاں نہیں
یہ جلوہ گاہِ ناز ہے کیوں اتنا اضطراب — اے دل ٹھہر کہ معرکۂ امتحاں نہیں
لے جائیگی کہاں مجھے اے وحشتِ جنوں — وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

مشتاق سنگِ در کی ہے کب سے جبینِ شوق
سجدے کی آرزو ہے مگر آستاں نہیں

سنہ ۱۹۳۶

شوقِ الفت کا نتیجہ سر بسر کچھ بھی نہیں — مبتدائے عشق وہ جس کی خبر کچھ بھی نہیں

سوچتے ہیں کیا دعا مانگیں کہ ہے وقتِ سحر
رات بھر روتے کٹی لیکن اثر کچھ بھی نہیں

برہمیِ بزم بھی تھی اک تماشائے خیال
شمع کے خاموش ہوتے ہی سحر کچھ بھی نہیں

اضطرابِ عشق سے جاتا رہا وہ ذوقِ دید
پردہ اُٹھنا تھا اُٹھا پیشِ نظر کچھ بھی نہیں

چھوڑ کر آئے ہیں ہم میخانۂ دیر و حرم
جس طرف لیکر چلا رہبر اُدھر کچھ بھی نہیں

عشق کی نیرنگیوں نے آہ رسوا کر دیا
سوزِ دل سوزِ نہاں سوزِ جگر کچھ بھی نہیں

بیخودوں کی ایک حالت میں گزر جاتی ہے شوقؔ
کیا دیارِ عشق میں شام و سحر کچھ بھی نہیں

۱۹۳۷ء

یہ کس کی جستجو ہے اور میں ہوں
مقامِ دشت ہو ہے اور میں ہوں

چمن میں دیکھتا پھرتا ہوں کس کو
فریبِ رنگ و بو ہے اور میں ہوں

بروزِ حشر تازہ گل کھلے گا
وہ دامن کا لہو ہے اور میں ہوں

کبھی دیوانہ تھا پر اب ہوں ہشیار
گریباں کا رفو ہے اور میں ہوں

حماقت حضرتِ واعظ کی دیکھو
تقاضائے وضو ہے اور میں ہوں

نہ پوچھو دل میں کیا کیا حسرتیں ہیں
تمھاری آرزو ہے اور میں ہوں

بھلا ہو تشنہ کامی اور تیرا
مے و جام و سبو ہے اور میں ہوں

رہوں گا کہہ کے دل کا ماجرا سب
ارے محشر میں تو ہے اور میں ہوں

وہ کہتے ہیں کہو اے شوق کیا ہے
ارے خلوت ہے تو ہی اور میں ہوں

سنہ ۱۹۳۷ء

نقابِ رخ الٹ دی ہم نے شوقِ دیدِ جاناں میں
دلِ بیتاب نے ہلچل مچا دی بزمِ جاناں میں
تہیدستانِ قسمت کیا کہیں میں اور ان سے کیا پوچھیں!
یونہیں ہنسنے بھی دی جانے بھی دے ای بیخودِ وحشت
درِ پیرِ مغاں پر کیا سمجھ کر ہاتھ پھیلائیں۔
نہ سمجھے جو کسی کی اور نہ اپنی کہہ سکے کچھ بھی

بجز حیرت نہیں باقی رہا کچھ چشمِ حیراں میں
صدای نغمہ بھی گم ہو گئی سازِ پریشاں میں
نہ جانے کیا نظر آیا کسی کے حسنِ عریاں میں
بہت کم فرق اب باقی ہے دامان و گریباں میں
کوئی جامِ سفالیں تک نہیں ہے دستِ حرماں میں
چلا ہے ایسا دیوانہ کہاں بزمِ حریفاں میں

تمھیں ہو کس لیے ای شوق روزِ حشر کی پروا
جھکے گا خود بخود یہ سر جبالِ شرمِ عصیاں میں

سنہ ۱۹۳۷ء

دل میں ہے شوق کہ میں عشق کا دیوانہ بنوں
خود ہی بیگانہ بنوں خود ہی میں جانانہ بنوں
مے سرِ جوش بنوں شیشہ و پیمانہ بنوں
ہے تقاضائے جنوں ضعف سے لرزاں ہے قدم
دیدۂ دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا افسوس!

ایسی افتاد نہ پڑ جائے کہ فرزانہ بنوں
عشق بھی خود ہی بنوں خود ہی میں دیوانہ بنوں
رندِ مے نوش بنوں ساقیِ میخانہ بنوں
رہوں آبادی میں یا رونقِ ویرانہ بنوں
متحیر ہوں جنوں کس کا میں افسانہ بنوں

مے سرجوش سے لبریز ہے دل ساقی　　کیف وہ ہو ہمہ تن لغزشِ مستانہ بنوں
کثرتِ حسن ہے اور چشم بصیرت کوتاہ　　دل کی حسرت ہی رہی یہ کہ جلوہ خانہ بنوں
حسن دلکش کی کشش تو ہے بلا کی لیکن　　ہوش رہتے ہوئے ممکن نہیں دیوانہ بنوں

سجدۂ عشق ادا ہو تو کہاں ہو اے شوقؔ
آرزو دل کی ہے کعبہ بنوں بتخانہ بنوں

۱۹۳۸ء

دل سے کہدو گم نہ ہو آئینۂ تنویر میں　　جلوۂ خاموش دیکھے پیکرِ تصویر میں
اب نہ وہ سودا رہا سر میں وہ شوریدگی　　ہے مرا پائے جنوں کیوں حلقۂ زنجیر میں
دیر سے نکلے حرم چھوڑا زمانہ بیں پھر کر　　اور آگے دیکھیے لکھا ہے کیا تقدیر میں
کونسے دیوانہ تھا زخمہ زن ساز جنوں　　کیف وہ باقی نہیں اب نغمۂ زنجیر میں
منظر مستانہ ہے اور سازِ فطرت نغمہ زا　　اے خوشا ہے ہر فضا ڈوبی ہوئی تاثیر میں
وہ تو سننا چاہتے ہیں کیا کہیں ہم داد عشق　　خامشی گویا ہے اک رازِ نہاں تقریر میں
وہ دکھائیں حشر سامان عشق نیرنگیاں　　رنگ رُخ آخر سمٹ کر رہ گیا تصویر میں
چاک دامانیٔ قسمت کا کوئی چارہ نہیں　　اب کسے تابِ رفو ہے دامنِ تدبیر میں

کیا غرض تھی شوقؔ کیوں سنتے ہماری داستان
جانتے تھے وہ کہ ہے ڈوبی ہوئی تاثیر میں

سنہ ۱۹۳۸ء

ستم زدوں پہ ستم اور ڈھائے جاتے ہیں
جو مر مٹے ہیں وہی پھر مٹائے جاتے ہیں

سوائے گریۂ پیہم کوئی علاج نہیں
بھڑک اٹھے ہیں جو شعلے بجھائے جاتے ہیں

جسے ہو دیکھنا آئے وہ دیکھ لے منظر
فنا و ہستی کے جھگڑے چکائے جاتے ہیں

قبول ہو کہ نہ ہو سجدۂ جبین نیاز
وہ محویت ہے کہ ہم سر جھکائے جاتے ہیں

یہ درد دل کی کہانی ہے عشق کی روداد
سنو سنو نہ سنو ہم سنائے جاتے ہیں

چلو بھی چھوڑ کے اے شوق جلوہ گاہ مجاز
حریم ناز کے پردے اٹھائے جاتے ہیں

ردیف و

سنہ ۱۸۸۵ء

خدارا آنکھ بھی چیتون سے نہ اے رشک قمر دیکھو
کلیجہ چھیدتی جاتی ہے یہ ترچھی نظر دیکھو

مجھے گر قتل کرتے ہو تو جھگڑا ہی مٹا دینا
رہے باقی نہ اب کی بار پیاری کچھ کسر دیکھو

کہاں تھے رات کو کھٹی خمار آلودہ انکھیں ہیں
یہ چہرہ آج کیوں اترا ہوا سا ہے ادھر دیکھو

نہ خنجر بھی قاتل سے لڑائی آنکھ بے کھٹکے
ذرا انصاف سے یارو مرے دل کا جگر دیکھو

ہمیں سے او بگڑتے ہیں غیر کو وہ پاس بٹھلائیں
ہماری آہ کا اے شوق یہ الٹا اثر دیکھو

سنہ ۱۸۸۸ء

دور بادہ بھی نہ ہو سبز گلستاں بھی نہ ہو
چشم گریاں بھی نہ ہو نوح کا طوفاں بھی نہ ہو

یا تو بے درد ہی اچھا ہوں میں یا ای بیدرد — درد وہ دے مجھے جس درد کا درماں بھی نہ ہو
ان پری رویوں سے امید وفا رکھتا ہے — تجھسا ای دل کوئی دیوانہ و نادان بھی نہ ہو
اے قضا کوئی نرالی ہی ادا ہو پے قتل — تیغِ ابرو بھی نہ ہو ناوکِ مژگاں بھی نہ ہو
ٹوٹنے کے لئے حیلہ ہی اسے کافی ہے — دل شکستہ کی طرح یہ ترا پیماں بھی نہ ہو
حیف اُس کشتۂ غربت پہ کہ جس کے سر پر — حسرت و یاس و تمنا کوئی گریاں بھی نہ ہو

ہے سفر دور کا اور ساتھ میں ہمدم بھی نہیں
تجھ سا اے شوق کوئی بے سر و ساماں بھی نہو

۱۸۸۹ء

تو گرفتارِ محبت کبھی آزاد نہ ہو — قید میں قید رہے قید کی میعاد نہ ہو
میں تو خاموش رہوں ہجر میں ڈر ہے لیکن — درد اُٹھ کر کہیں آمادۂ فریاد نہ ہو
تم میں پنہاں ہیں محبت کے ہزاروں جلوے — اے مری خاک کے ذرو کہیں برباد نہ ہو
کچھ ہیں بکھرے ہوئے پر کنج قفس کے باہر — خوف ہے اور بھی رسوا کہیں صیاد نہو
پھوٹ کر کس کے یہ رونے کی صدا آتی ہے — دردِ الفت کہیں میرا دل ناشاد نہ ہو
دل کی ایذا طلبی پوچھ لوں کیا کہتی ہے — ٹھہرو ٹھہرو ابھی دم بھر کوئی بیداد نہ ہو

شوق کردوں جو بیاں کاوش غم کی حالت
اپنا قصہ بھی کم از قصۂ فرہاد نہ ہو

سنہ ۱۹۲۳ء

لب فریاد وا کیوں ہو سر شور و فغاں کیوں ہو
زمیں پر حشر قبل از وقت پر آسماں کیوں ہو

ہو دل کی لگی تو نالۂ و آہ و فغاں کیوں ہو
نہ بھڑکے آتشِ فرقت تو آہوں کا دھواں کیوں ہو

کسی پر ہمنفس اظہار سوز جاں ستاں کیوں ہو
صدائے دردِ دل مسازِ آہنگِ فغاں کیوں ہو

اسی پر جب نیاز بندگی کا حصر ٹھیرا ہے
ہمارے سجدۂ سر کو بتوں کا آستاں کیوں ہو

ادھر گلچیں کا کھٹکا ہے ادھر صیاد کا ڈر ہے
بہارِ بے خزاں کنج قفس میں گلفشاں کیوں ہو

بنے گا کون خضر راہ پھر صحرا نوردی میں
ہمارا پائے وحشت نیز زنجیر گراں کیوں ہو

خدا کا نام لے اے شوق یہ سرمستیاں تلکے
خمارِ شب سحر تک تکیۂ خوابِ گراں کیوں ہو

سنہ ۱۹۱۷ء

عینِ راحت جانتے ہیں قید کی تعزیر کو
چھوڑتے دیوانے کب ہیں حلقۂ زنجیر کو

ڈھونڈتی پھرتی ہے کس کا دل تری ترچھی نظر
جی میں آتا ہے کہ میں رکھ لوں بھٹکتے تیر کو

جان کر صید زبوں چھوڑ آئے صحرا میں جسے
ڈھونڈنے پھر آپ کیوں جاتے ہیں اس نخچیر کو

ہو چکا ہے جس قدر الفت میں رسوائے جہاں
بس وہی کافی ہے ظالم شوق کی تشہیر کو

سنہ ۱۹۲۳ء

دل ہے دیوانہ تمہارا دیکھ لو
دیکھ لو اس کا تماشا دیکھ لو!

اپنے خنجر کا تماشا دیکھ لو — پارہ پارہ دل ہمارا دیکھ لو

تیروں کی بوچھار سے وہ تپ گیا — میرا ننھا سا کلیجہ دیکھ لو

اپنی طبیعت سے تو ہم بھی تنگ ہیں — اُس نے پھر اب رنگ بدلا دیکھ لو

جس جگہ پیکاں تمھارا تھا چھپا — پھر وہیں پہ درد اُٹھا دیکھ لو

دل کو یوں پامال ہونا تھا ضرور — یہ بھی قسمت کا تھا لکھا دیکھ لو

ہو دگرگوں حالتِ حرماں نصیب — گر نہ ہو باور تو اچھا دیکھ لو

شوقِ بے چارہ پہ کیوں اتنا ستم
وہ بھی ہے بندہ خدا کا دیکھ لو

سنہ ۱۹۲۳ء

اللہ سے منہ پھرانے والو — ہو شرم گنہ تو منہ چھپا لو

کیا بیٹھے ہو تیغ کو سنبھالو — اُٹھو آئی ہوئی کو ٹالو

سوتے سوتے کیا سویرا — کھوئی ہوئی راہ جانے والو

آنسو نہیں دُرِ بے بہا ہیں — گر جائیں نہ خاک پر سنبھالو

دل کا ہمراز ہو گیا ہے — اب تیر نہ سینہ سے نکالو

ہم بھی تو سنیں تمھیں ہوا کیا — اے بیخودو کچھ تو بولو چالو

دل ہی تو ہے خود مچل گیا تھا — جو کچھ ہوا اُس پہ خاک ڈالو

کیا چین سے سوتی ہو نہ خاک — چونکو اُٹھو تو سونے والو

ایسا نہ ہو دل تمھارا بھر آئے
زخموں کو نہ میرے دیکھو بھالو

یہ عرض ہے شوق کی کہ دل سے
بغض و کینہ ۔ حسد نکالو

سنہ ۱۹۲۰ء

سنا لو جس قدر چاہو مجال اُف کہاں مجھکو
زباں رکھتا ہوں لیکن تم سمجھ لو بے زباں مجھکو

طلب کیوں کر رہے ہیں پھر وہ بہر امتحاں مجھکو
جب اُن کی تیغ کھنچتی ہے نہ ڈالو درمیاں مجھکو

اسیر تازہ ہوں آتی نہیں طرز فغاں مجھ کو
سکھا کر کچھ نوا سنجو بنا لو ہم زباں مجھ کو

جگر کا قصۂ پر سوز بھی ٹھہرو سناؤں گا
ذرا تم ختم تو کر لینے دو دل کا بیاں مجھکو

لباسِ جسم سے دستِ جنوں کی نبھ نہیں سکتی
اُڑا نے دے یونہیں اے جوشِ وحشت دھجیاں مجھکو

مریضِ عشق کی حالت نہ پوچھو کچھ زمانے سے
سمجھ لو اپنے دل میں طائر رنگ خزاں مجھکو

مزے سے پھر سناؤں بزم میں افسانۂ اُلفت
تمھاری شمع سوزاں دے اگر اپنی زباں مجھکو

سکھا دوں کھینچنا آہیں اسیرانِ محبت کو
سہارا اگر کہیں مل جائے زیر آسماں مجھکو

دل و دیدہ رہے دونوں ہی اب تک بدگماں مجھ سے
نہ اِن میں سے بنایا ایک نے بھی رازداں مجھکو

کجا بتخانہ و کعبہ ۔ کجا خمخانہ و ساقی
کہاں سے شوق ۔ شوقِ دید لایا ہے کہاں مجھکو

سنہ ۱۹۲۳ء

ہم کو وہ درد چاہیئے جس کی دوا نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے جو درد آشنا نہ ہو

کچھ لذتِ آشنائیٔ خلش ہو چلا ہے دل — پیکانِ تیرِ یار ابھی سے جدا نہ ہو
پھر چشمِ فتنہ ساز کی ہو دل سے چھیڑ چھاڑ — آشوبِ حشر ڈر ہے کہیں دیکھتا نہ ہو
سیرِ چمن کو آئے ہیں خود ہو کے بے نقاب — اور اُس پہ کہہ رہے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
اے دل فغان و شورشِ بیجا بہ تا بہ کے — ہاں ٹوٹ اس طرح کہ کہیں سے صدا نہ ہو
سنتے نہیں ہیں وہ نہ سُنیں ماجرائے دل — محشر میں مجھ سے اُن کا کہیں سامنا نہ ہو
کیا فائدہ جو بزم میں افشائے راز ہو — ہاں چھیڑ چھاڑ پردے میں ہو برملا نہ ہو
خاموش ہم ہیں وہ ہیں ستم پر تلے ہوئے — کس سے یہ ہم کہیں۔ کہیں بنتا خدا نہ ہو

ہاں ہاں تمہیں ہو شوق کو جس نے مٹا دیا
باتیں بناؤ اُس سے جو پہچانتا نہ ہو

۱۹۲۴ء

اور اُس بیداد گر کو پُر جفا ہونے تو دو — ہاں اسی پہلو میں کچھ دل کا بھلا ہونے تو دو
لذتِ دردِ جگر کی پوچھ لینا خوبیاں — دل کو میرے تم ذرا درد آشنا ہونے تو دو
ڈھونڈھ ہی لے گا جہاں رہتی ہے تاثیرِ دعا — دستِ بیکس کو ذرا دستِ دعا ہونے تو دو
نغمہ سنجی پھر اُسی گلشن میں ہو گی دیکھنا — ہمصفیرو قید سے مجھ کو رہا ہونے تو دو
شاید اس ترکیب سے قابو میں آجائے کبھی — دل کو رہ رہ کر سزاوارِ خطا ہونے تو دو

شوق جیسے بندۂ الفت کی توبہ دیکھ لی
ایک ہی حضرت ہیں ان کو پارسا ہونے تو دو

۱۹۲۳ء

رنج و الم میں جوش تھا شکووں کے تار کو
کیا روک لیتے گریۂ بے اختیار کو

حق نے دیا ہے اوج یہ مجھ خاکسار کو
رشکِ فلک بنا دیا مشتِ غبار کو

وہ آرہے ہیں دیکھنا ہے وقتِ امتحان
گھبرا کے کھو نہ بیٹھنا صبر و قرار کو

لے شوقِ دید صبر و تحمل سے کام اگر
بے پردہ خود نقاب کرے حسنِ یار کو

محشر میں ہے پکار تمھاری اٹھو چلو
اے سونیوالے قبروں کے چھوڑو مزار کو

یادِ وطن کی طرح رہی بیکسی بھی ساتھ
چھوڑا نہ تا بمرگ غریب الدیار کو

چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال
لے آئے ساتھ ہستیِ ناپائیدار کو

دیکھیں نظر بھی پڑتی ہے اس پر کسی کی شوق
آئے ہیں لے کے ہم دلِ امیدوار کو

۱۹۲۴ء

کسی سے التجا کیوں ہو، کسی کا آسرا کیوں ہو
جو مستغنی ہو عالم سے تو عرضِ مدعا کیوں ہو

ستم ہے مہرِ خاموشی کا اب لب پر لگا رہنا
تمھارے روبرو آکر دلِ بے مدعا کیوں ہو

گمانِ نارسائی آہ پر ہے دل میں جتنک ہے
اگر نکلے دلِ صد چاک سے تو نارسا کیوں ہو

اسیرو اہمِ الفت و دید کیوں ٹھوکریں کھائے
ملے گر آستاں تیرا گدائے بینوا کیوں ہو

جگر میں چٹکیاں گر یادِ جاناں لے نہ رہ رہ کر
کھٹک تھم تھم کے پیدا کیوں ہو دل درد آشنا کیوں ہو

محبت نے بنایا حسن کو رسوائے عالم
نہ ہو گر عشق پردہ در تو کوئی مبتلا کیوں ہو

بتانِ شمع رو سے شوقؔ تم نے لو لگائی ہے
بتاؤ تو حریمِ حق میں مصروفِ دعا کیوں ہو

١٩٢٧ء

منظور اگر دل تجھے اظہارِ وفا ہو
پس پس کے کفِ پا کیلئے رنگِ حنا ہو

وہ درد ہو دل میں کہ چمک جس میں سوا ہو
ایسی ہو کھٹک جس کی چمک میں بھی مزا ہو

ڈھونڈی ہے وہ بھی جس کو نہ ملے بابِ اجازت
بھٹکی ہوئی ایسی بھی کسی کی نہ دعا ہو

اے دورِ فلک تجھ کو قسم اپنے ستم کی
جاتی ہوئی دنیا میں کسی کا تو بھلا ہو

باقی ہو میں خام ہو اک جام کی دل میں
دارین میں اے پیرِ مغاں تیرا بھلا ہو

راضی بہ رضا ہوں جسے آنا ہو وہ آئے
آفت ہو کوئی قہر ہو یا کوئی بلا ہو

اے شوقؔ پلٹ آتی ہیں رہ رہ کے نگاہیں
کیا ہو جو درِ دید کا پردہ بھی اٹھا ہو

١٩٢٧ء

کیا تاراج تو نے اے خزاں سارے گلستاں کو
دل پر داغ ہیں باقی رکھا گلہائے حرماں کو

نہ بھرنے پائیں زخمِ دل ہے کچھ مٹ بھی باقی
اسی دن کے لئے ہم نے لگا رکھا تھا پیکاں کو

دعائے خیر اب یہ ہی وفورِ دردِ الفت میں
خدا رکھے تمنائے دلِ شوریدہ ساماں کو

تھکے ماندے مسافر رہ گئے جب دورِ منزل سے
تو پھر تا صبح وہ کوسا کیے شامِ غریباں کو

یہ حالت بخیہ گر کی تھی کہ خوفِ دستِ وحشت سے
ملا کر سی دیا اک ساتھ داماں و گریباں کو

ہزاروں خونِ ناحق کی شہادت اس سے ملتی ہے
خدا آباد رکھے تا ابد گنجِ شہیداں کو

کہاں تک شوقؔ فکرِ چارۂ بے سود کی جائے
خدا پر چھوڑ دو بس اب دلِ پُرخوں کے داماں کو

۱۹۳۱ء

اثر جس کا نہ کچھ بھی ہو وہ آہِ ناتواں پھر ہو
خلش پیدا ہو وہ دل میں وہی دردِ نہاں پھر ہو

وہی نالہ وہی شیون وہی طرزِ فغاں پھر ہو
زبانِ شمعِ سوزاں سے مصیبت کا بیاں پھر ہو

اٹھا دو پردۂ ظلمت تو اک جلوہ عیاں پھر ہو
کسی کی جستجو ہو اور تلاشِ لامکاں پھر ہو

اس آزادی سے کیا حاصل جو کھٹکے سب کی آنکھوں میں
وہی کنجِ قفس ہو ہم ہوں اور ضبطِ فغاں پھر ہو

تمہاری نیچی نظروں سے تو کچھ کہتے نہیں بنتا
وہی اک تیر ہاں آئے جو دل کا رازداں پھر ہو

فروغِ بزمِ تنہائی ہو میں محوِ تماشا ہوں
جبیں سائی ہو میری اور تیرا آستاں پھر ہو

ارے او محوِ غفلت کچھ سبق لے دورِ گردوں سے
کسے معلوم کیسا انقلابِ آسماں پھر ہو

ادا سرکش فلک دشمن تمہاری تیغ بھی برہم
ٹھکانا کشتۂ الفت کا کہیئے تو کہاں پھر ہو

کہو اے شوقؔ بہکی بہکی باتیں آج ہیں کیسی
خمارِ بادۂ سرجوش سے کیا سرگراں پھر ہو

۱۹۳۲ء

نظر ہے سوئے قاتل طرزِ بسمل دیکھتے جاؤ
ادھر آؤ ذرا اندازِ قاتل دیکھتے جاؤ

ہمارا بخت واژوں ناؤ ڈوبی ناخدا غائب
محیطِ عشق میں گردابِ ساحل دیکھتے جاؤ

نفس کی آمد و شد پر بھروسا کیا تماشہ ہے / نہ بجھ جائے چراغِ سعیِ حاصل دیکھتے جاؤ

نہ پوچھو دل جلوں سے کیا گزر جاتی ہے الفت میں / بسانِ شمعِ سوزاں رنگِ محفل دیکھتے جاؤ

سفر ہے دور کا رستہ کٹھن اے قافلے والو / نشانِ رفتگاں منزل بہ منزل دیکھتے جاؤ

تلاطم میں تماشہ ہے وہ موجوں کی ہم آغوشی / حبابوں سے ہے ہم آغوشِ ساحل دیکھتے جاؤ

سبق آموزِ عبرت ہے نہ دیکھو رقصِ بسمل کو / ارے او مرنے والو شانِ قاتل دیکھتے جاؤ

تمناؤں کو ملتے خاک میں تم نے نہیں دیکھا / ادھر آکر مآلِ حسرتِ دل دیکھتے جاؤ

قیامت ہے نہیں سنتے گرفتارانِ الفت کی / کہیں کیا سختیٔ قیدِ سلاسل دیکھتے جاؤ

وہاں پہونچا ہو شوقِ لاابالی کیا عجب لیکن
کچھ آگے بڑھ چلو فردوسِ منزل دیکھتے جاؤ

سنہ ۱۹۳۴ء

وحشتِ دل نے کہیں کا بھی نہ رکھا مجھکو / دیکھنا ہے ابھی کیا کہتی ہے دنیا مجھکو

اثرِ قیدِ تعین سے بھی آزاد ہے دل / کس طرح بندِ علایق ہو گوارا مجھکو

لینے بھی دے ابھی موجِ لبِ ساحل کے مزے / کیوں ڈبوتی ہے ابھرنے کی تمنا مجھکو

خواہشِ دل تھی کہ ملتا کہیں سودائے جنوں / میں نے کیا مانگا تھا قسمت نے دیا کیا مجھکو

تیری بے پردگیٔ حسن نے آنکھیں کھولیں / تنگ دامانیِ نظارہ تھی پروا مجھکو

آخری دور میں مدہوش ہوا تھا لیکن / لغزشِ پا نے مری خوب سنبھالا مجھکو

عمر ساری تو گئی دیر و حرم میں اے شوق
اُس پہ سجدہ بھی تو کرنا نہیں آیا مجھکو

۱۹۳۵ء

دل میں اگر نہ عشق و محبت کی چاہ ہو — نالہ نہ درد ہو نہ فغاں ہو نہ آہ ہو
رسوا نہ اعتبارِ تغافل کو کیجیے — کیا فائدہ کہ پرسشِ دل گاہ گاہ ہو
دشمن سے پوچھتا ہوں نشانِ حریمِ ناز — میری طرح سے کوئی نہ گم کردہ راہ ہو
راہِ جنوں میں مجھ کو کسی سے نہیں ہے کام — بس میں ہوں اور اک دلِ شورش پناہ ہو
کر اب تو فکرِ حسنِ عمل کوچ ہے قریب — رستہ کٹھن ہے ساتھ میں کچھ زادِ راہ ہو
توہینِ شانِ عفو ہے عصیاں سے اجتناب — یعنی گناہگار ہے جو بے گناہ ہو

دنیا میں ایسے لوگوں سے پالا پڑے نہ شوق
ظاہر ہو جن کا صاف تو باطن سیاہ ہو

۱۹۳۳ء

فرقت میں کیا سکونِ دلِ ناصبور ہو — جب شام ہی سے آمدِ صبحِ نشور ہو
تابِ نظر نہیں ہے ذرا دیکھ بھال کے — ایسا نہ ہو کہ شیشۂ دل چور چور ہو
اے برقِ حسن ہوں بھی کہیں جلوہ پاشیاں — یہ کیا ضرور ہے کہ وہی کوہِ طور ہو
اک دردِ دل تھا اُس کو بھی کیا جانے کیا ہوا — کیا اُس سے بس چلے کہ جو آنکھوں سے دور ہو
چونکیں گے خواب سے نہ کبھی خفتگانِ عشق — شورِ نشور وہ ہو کہ آوازِ صور ہو

پیشِ نظر ہیں نقش و نگارِ بساطِ دہر | دل کے لیے اک آئینہ حسنِ شعور ہو
اے ساکنانِ بامِ فلک دیکھتے ہو کیا | کچھ کہتے سنتے تم سے مگر تم تو دور ہو
پاؤں کہاں سے شوق وہ اگلی سی صحبتیں
وہ دل نہیں کہ بزمِ نشاط و سرور ہو

سنہ ۱۹۳۳ء

شرم آلود کہیں دیدۂ غماز نہ ہو | دلبری کا کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو
دور سے درد بھری ایک صدا آتی ہی | میرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہیں آواز نہ ہو
لذّتِ درد کا مہجور سہارا کیوں لیں | لطفِ تنہائی تو جب ہی کوئی دمساز نہ ہو
شکر صد شکر کہ اے شوق مرا طائرِ دل | بال و پر ہوتے ہوئے مائلِ پرواز نہ ہو
منتظر بزم ہی آ جائیں بصد عشوۂ و ناز | شرط یہ ہی کہ نگاہِ غلط انداز نہ ہو
یہ بھی کیا دور ہی نیرنگیٔ عالم تیرا | مرغِ آسودہ چمن زمزمہ پرداز نہ ہو
کثرتِ جلوہ میں گم ہی دلِ ہنگامہ فروز | بیخودی کہتی ہی میرا کوئی ہمراز نہ ہو
سرِ مقتل کوئی اس شان سے آئے اے شوق
لب پہ اعجاز نہ ہو چشمِ فسوں ساز نہ ہو

سنہ ۱۹۳۳ء

تلاشِ جلوۂ دلکش میں سرگرمِ تماشا ہو | ٹھہر اے اضطرابِ دل کہ آخر کون رسوا ہو
کوئی سامانِ شورش اے دلِ سرگشتہ پیدا ہو | وہی وحشت وہی جوشِ جنوں ہو سر ہو سودا ہو

دلِ ہنگامہ زا کو چھوڑ بھی دو اپنی حالت پر
بہت مچلا ہوا ہی دیکھیے فتنہ نہ برپا ہو

ہمیں تو ڈھونڈھنے سے بھی مقام ایسا نہیں ملتا
جہاں آشوبِ ناکامی نہ ہو نیرنگِ دنیا ہو

میں سرمستِ ازل ہوں میکدہ کی کچھ نہیں پروا
غرض تو بیخودی سے ہے نہ صہبا ہو نہ مینا ہو

رگِ جاں پر دلِ ناساز تو ہی زخمہ زن ہو کر
کوئی چھیڑ ایسا نغمہ جس سے سوز و ساز پیدا ہو

کیا ہے دل کو بیخود کیا کسی کی جلوہ باری نے
حریمِ عشق ہو اور شوق ہو حسنِ خود آرا ہو

ردیف "ہ"

سنہ ۱۹۲۵ء

سمجھتے ہیں خطِ ساغر کو جو تحریرِ میخانہ
لبِ ساغر سے سنتے ہیں وہی تقریرِ میخانہ

چمک جاتی ہے فصلِ گل میں کیا تقدیرِ میخانہ
فروغِ جامِ مے سے بڑھتی ہے تنویرِ میخانہ

نہیں ہے ذکرِ حق سے خالی ہو حق بادہ نوشوں کی
صدائے نعرۂ مستانہ ہے تکبیرِ میخانہ

گنہ سرزد ہو جو پینے میں وہ ہے عفو کے قابل
سزاوارِ سزا ہوتی نہیں تقصیرِ میخانہ

پڑی ہیں پاؤں میں مستوں کے موجِ مے کی زنجیریں
اسیرِ بیخودی سب ہیں یہ ہے تعزیرِ میخانہ

شکستِ توبہ کی بنیاد تا برسوں ہے قائم
ہماری خاک ہو گی شاملِ تعمیرِ میخانہ

عروجِ نشہ میں کون و مکاں کی سیر کرتی ہیں
ہر آنکھوں میں ہماری جلوۂ تنویرِ میخانہ

اُٹھو اے شوق اب تم کر چکے ہو خم کے خم خالی
تمھاری کوئی ملکیت نہیں جاگیر میخانہ

سنہ ۱۹۳۶ء

مے کا یہ احترام ارے توبہ
اور پھر وہ حرام ارے توبہ

دل کو سرمست کر ہی دیتی ہے
یاد ساقی و جام ارے توبہ

اللہ اللہ کرا رے زاہد
جام مے صبح و شام ارے توبہ

بت پرستی میں جس کی عمر کٹی
ایسے کافر کا نام ارے توبہ

ایک بیجاں کے قتل کرنے کو
اس قدر اہتمام ارے توبہ

تشنۂ خوں ہے ایک مدت سے
خنجر بے نیام ارے توبہ

غمزدوں کی یہ خامشی ہی غضب
صبر کا انتقام ارے توبہ

کہتے کہتے وہ قصۂ شب غم
رہ گیا نا تمام ارے توبہ

آج بھولے سے لے لیا کس نے
شوقِ رسوا کا نام ارے توبہ

ردیف ی

سنہ ۱۸۸۶ء

شیشۂ دل میں اتر تیر وہ کے پیکان گئے
قدر انداز قضا بھی تری قربان گئے

لاکھ در پردہ لگاوٹ کی ہوں باتیں لیکن
جیسے بانیٔ جفا ہو تمھیں ہم جان گئے

دیکھنا کوئی جفا ہیں نہ کمی رہ جائے
ہاں ستمگر تیری بیداد کے قربان گئے

تیر مژگاں کی بھی دعوت نہ ہوئی کچھ دل سے
کیسے ہو ہو کے کشیدہ مرے مہمان گئے

لاکھ تم روٹھو مناؤ گے نہ ہم بھی ہرگز
تم ہمیں جان گئے ہم تمھیں پہچان گئے

دل کے ملتے ہی وہ سودائے جنوں بھی نہ رہا
ولولے سب وہ گئے اور وہ ارمان گئے

گزری باتوں کا تو اب فکر عبث ہے اے شوق
وہ زمانہ گیا وہ دن ارے نادان گئے

سنہ ۱۸۸۹ء

کسی شعلہ رو کی جو یاد آ گئی
مرے دل میں اک آگ بھڑکا گئی

شبِ وصل بھی نیچی نظریں رہیں
حیا جانے کیا تم کو سمجھا گئی

بس اب رخصت اے یاس و حرمانِ دل
اجل کہہ رہی ہے کہ میں آ گئی

تمھاری ادائیں سلامت رہیں
قضا کو قضا آ گئی - آ گئی

نئے بھیس ہر دم بدلتی ہے کیوں
تمھاری ادا کیا قضا پا گئی

فنا یا ہوا جانے کس کا تھا دل
اُسی کی اُسے یاد تڑپا گئی

عجب زندہ دل تھا زمانے میں شوق
خدا جانے کس کی نظر کھا گئی

سنہ ۱۹۱۷ء

دل کو میرے روبرو سمجھائیے — آپ ہی اس کی زباں کھلوائیے
جی میں ہے اُن کو بٹھا کر سامنے — آئے جو دل میں اُسے کہہ جائیے
جو نہ سمجھے نیک و بد اچھی بُری — ایسے دیوانہ کو کیا سمجھائیے
اُس کا کوچہ چھوڑ کر جائیں کہاں — دل یہ کہتا ہے یہیں مٹ جائیے
ہو گئی پردے میں وہ صورت نہاں — دل کو کس صورت سے اب بہلائیے
سامنے منزل کے آ کر تھک گئے — ضعف کہتا ہے یہیں رہ جائیے

پھیر کر رُخ شوق سے کہتے ہیں وہ
درد ہوتا ہے کہاں دکھلائیے

سنہ ۱۹۱۸ء

دل جو ٹھہرا تو وفا یاد آئی — یاد آئی بھی تو کیا یاد آئی
وائے بر حالِ طبیبِ ناداں — اب دمِ نزع دوا یاد آئی
ٹھنڈی سانسیں جو بھریں کیا باعث — سچ کہو کس کی وفا یاد آئی
خاک میں دل کو جو ملتے دیکھا — ہم کو تصویرِ بقا یاد آئی
غیظ میں شوخ نے الٹی جو نقاب — ہو گئے بے پردہ حیا یاد آئی
ہستیٔ شمع تھی عبرت آموز — ہم کو بھی اپنی قضا یاد آئی
خیر ہے۔ دل کی ہے کیوں تم کو تلاش — کیا کوئی تازہ جفا یاد آئی

شوق گمراہ سے پوچھے تو کوئی
کیا کبھی راہِ رضا یاد آئی

سنہ ۱۹۱۸ء

جنوں کو کب سے ہیں بھولے ہوئے بھلائے ہوئے
زمانہ ہو گیا دل کو مٹے مٹائے ہوئے

جگر کی خیر ہو سینے میں آگ پھر بھڑکی
ابھی تو بیٹھے تھے دل کی لگی بجھائے ہوئے

تمھارے جلوے پس پردہ تھے جو خلوت میں
نگاہِ شوق میں اب تک ہیں وہ سمائے ہوئے

کسی کے رشتۂ الفت میں ہم ہیں حلقہ بگوش
اُسی کو رہتے ہیں ہر دم گلے لگائے ہوئے

چُرا کے لے ہی گئی وہ نگاہِ دزدیدہ
بہت دنوں سے سینہ میں دل چھپائے ہوئے

اُٹھائے سے نہیں اُٹھتے ہیں تیرے متوالے
کچھ ایسے سوئے ہیں جاگے ہوئے جگائے ہوئے

ستم اُٹھانے کے قابل کہاں ہے اب دلِ زار
کسی کی مشقِ جفا سے ذرا بچائے ہوئے

جنوں سے کہہ دو سمجھ کر ستم کریں اے شوق
خدا کے بندے خدا سے ہیں لو لگائے ہوئے

سنہ ۱۹۱۹ء

دیکھنا حشر میں کیسی مری روداد رہے
اُن کو کیا یاد رہے مجھکو نہ کیا یاد رہے

خاک میں مجھکو ملا کر نہ کہیں کا رکھا
چین تجھکو نہ کبھی اے دلِ ناشاد رہے

وار کھا کر بھی تڑپنا نہ ہمیں یاد رہا
دیکھتے یاس سے ہم جانبِ جلاد رہے

دل کی بیتابی و حسرت کا کھنچا ہو نقشہ
رنگ اڑتا ہوا تصویر کا بہزاد رہے

دل کو پہلو سے نکالوں گا پڑا رہنے دوں ‏— جو کہیں آپ سے ہی آپ کا ارشاد رہے

امتحاں دونوں کا ہو جائے تو جھگڑا ہی مٹے ‏— یا تو فریاد مری یا تری بیداد رہے

کوئی پہلو نہ انھیں شکوۂ بیجا کا ملے ‏— دھیان اتنا تجھے اے دل دمِ فریاد رہے

رہروِ ملکِ عدم جانتے ہیں کیسی خاموش ‏— سچ ہے بھولا ہوا قصہ انھیں کیا یاد رہے

عشق میں شوق بڑی عیش سے گزری لیکن

ایک دم قیدِ تعین سے نہ آزاد رہے

سنہ ۱۹۱۹ء

دل میں قصے ہی چکے دیکھ لے ارمانوں کے ‏— جو ملے پوری ہوئی کیا تری پیکانوں کے

اے جنوں مہرِ خموشی ہی لگی رہنے دے ‏— کون سنتا ہے فسانے ترے دیوانوں کے

بڑھ چلے دستِ جنوں آ گئی وہ فصلِ بہار ‏— تار بکھرے نظر آتے ہیں گریبانوں کے

دل بھر آیا کہ گری آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو ‏— خشک لب دیکھ کے ساقی ترے پیمانوں کے

تا سحر شمع کے آنسو نہ رکے پر نہ رکے ‏— رات بھر سوز میں جلتی رہی پروانوں کے

شوق ممکن ہی نہیں در سے صنم کے اٹھ جائیں

ہم تو نذر ہیں ازل سے انھیں بتخانوں کے

سنہ ۱۹۱۹ء

کیا تری چشمِ فسوں گر دل آہ للچائی نہ تھی ‏— لوٹ کر تجھ پہ طبیعت مری آئی نہ تھی

دل کے بیجا نیکا بھی اس پہ گماں ہوتا نہ تھا ‏— وہ نگاہِ شوخ تو کچھ ایسی للچائی نہ تھی

کس طرح ضبطِ فغاں کرتا شبِ فرقت میں آہ
کچھ دلِ بیتاب میں تابِ شکیبائی نہ تھی
آئے تھے روتے ہوئے ہم عالمِ ایجاد میں
واقفِ رازِ نہاں تھے حسرتِ گویائی نہ تھی
اِن بتوں کو دیکھ کر اب تو مچل جاتا ہے دل
شوقؔ پہلے سے طبیعت ایسی سودائی نہ تھی

١٩١٩ء

شبِ فرقت میں جب تک خون آئے قلبِ مضطر سے
لہو برسے لہو برسے ہماری دیدۂ تر سے
عجب حسرت سے آہِ سرد کھینچی ہے دمِ آخر
بہت مجبور ہو کر آج جاتی ہیں ترے گھر سے
بنا کر آئینہ خود ہیں کیا کیوں اِن حسینوں کو
یہ کیا اندھیر کی سوجھی کوئی پوچھے سکندر سے
دلِ بیتاب میرا کیا نیا کچھ رنگ لایا ہے
کلیجہ پکڑے کیوں گھبرائے وہ پھرتے ہیں محشر سے
زبانِ آبلہ خود کہہ چلیگی حال زار اپنا
ذرا تم چھیڑ کر دیکھو تو اُس کو نوکِ نشتر سے
لبوں پر مہرِ خاموشی لگی ہے نیز سنو سمجھے
اشاروں میں ہوا کرتی ہیں باتیں جام و ساغر سے
وفائے شوقؔ کا کچھ بھی نہیں ہے پاس او ظالم
کوئی یہ بھی طریقہ ہے وہ یوں دیدار کو ترسے

١٩١٩ء

نہ رہ رہ کے یہ دل پوچھتا ہے تیرِ نظر سے
چھپ چھپ کے یہ باتیں ہوئیں کیا زخمِ جگر سے
پہلو سے تڑپ کر دلِ مضطر نہ نکل آئے
اب دیکھ رہے ہیں وہ لگاوٹ کی نظر سے
وہ آگ لگی ہے دلِ سوزاں میں ہمارے
پھر جلتی ہیں دل میں ترا تیر آئے کدھر سے

کہتے ہیں اشاروں میں یہ حالِ دلِ گریاں — بے بس بھی ہیں۔ مجبور بھی ہیں دیدۂ تر سے
ای آہِ شرر بار ذرا اور بھڑکنا — آگاہ وہ ہو جائیں مری سوزِ جگر سے
وحشت نہ کہیں اور بڑھے دستِ جنوں سے — الجھے نہ کہیں چاک گریبان سحر سے
ای شوق مجھے خوف نہیں روزِ جزا کا
سب دھو گئے عصیاں مری اک دامنِ تر سے

سنہ ۱۹۱۹ء

کس بلا کی شوخ چشمی دیدۂ پُرفن میں ہے — چلبلاپن بھی غضب کا چلبلی چتون میں ہے
سوزِ پنہاں بلبلوں کے نالۂ وشیون میں ہے — آتشِ گل ہر طرف بھڑکی ہوئی گلشن میں ہے
جس کو دیکھا اک نظر فوراً وہ سودائی ہوا — سچ بتا یہ کون سا جادو تری چتون میں ہے
چار پھولوں کو بھی جس کی روح ترسی بعدِ مرگ — کشتۂ تیغِ تغافل آج وہ مدفن میں ہے
آشیانہ جس جگہ تھا بلبلِ ناشاد کا — خشک وہ شاخِ نشیمن آج تک گلشن میں ہے
نظروں نظروں میں اڑا لیتا ہے وہ پہلو سے دل — کس غضب کی تیز دستی بھی بتِ پُرفن میں ہے
اک اشارہ میں نکل جاتا ہے دل پہلو سے شوق
کس لگاوٹ کی کشش سفاک کے چتون میں ہے

سنہ ۱۹۱۹ء

پیکانِ ستم جتنے سینہ میں ہیں آ بیٹھے — خونابِ جگر پی کر دیتے ہیں دعا بیٹھے
افسانۂ غم اپنا جو تم کو سنا بیٹھے — کچھ یاد بھی ہے کہیے یا اس کو بھلا بیٹھے

حسرت بھی تمنا بھی، ارمان بھی ہیں دل میں ۔۔۔ اُٹھنا ہی تو درد اُٹھی ہاں اُن سے جدا بیٹھے

ملتے ہی نگاہوں کے وہ وار اُٹھایا ہے ۔۔۔ کیا چوٹ غضب کی تھی ہم دل پہ جو کھا بیٹھے

فرقت ہی نہ قربت ہی، آنا ہی نہ جانا ہے ۔۔۔ پہلو سے اُدھر اُٹھے دل میں اِدھر آ بیٹھے

کب فتنۂ خوابیدہ اس طرح اُٹھانا تھا
سوتے سے اُنھیں ناحق اے شوق جگا بیٹھے

۱۹۱۹ء

پس فنا بھی نہ ہم ترک آرزو کرتے ۔۔۔ کسی کی مجمع محشر میں جستجو کرتے

محال بخیہ گری تھی جراحت دل کی ۔۔۔ جگر کے چاک میں اے شوق کیا رفو کرتے

نہ اہل دید سے کچھ لن ترانیاں چاہیئں ۔۔۔ نگاہ بازوں سے کیا چھپ کے گفتگو کرتے

بھٹکتے پھرتے کدھر چھوڑ کے ترا دامن ۔۔۔ اُلجھتے تجھ ہی سے ساقی سبو سبو کرتے

اب اور دل کوئی ملتا تو پھر بدل لیتے ۔۔۔ کہاں تک ہم دل صد چاک میں رفو کرتے

جگر میں درد کھٹک دل میں تھی شب فرقت ۔۔۔ کمی تھی کس کی جو ہم اور آرزو کرتے

پلے تھے دامن مژگاں میں سوں طفل سرشک ۔۔۔ پھر اُن کی دیدۂ تر کیوں نہ آبرو کرتے

اخیر وقت میں کیا منہ بتوں سے موڑتے شوق
یہاں تو مر کے بھی سجدہ نہ قبلہ رو کرتے

۱۹۱۹ء

گھٹ گھٹ کے آرزو کہیں مشکل میں رہ گئی ۔۔۔ مت پوچھیے کہ کیا دل سائل میں رہ گئی

سینہ تو زیرِ زانوئے قاتل دبا رہا
حسرت تڑپنے کی دلِ بسمل میں رہ گئی

حسرت بھری نگاہ نہ کیا جانے کیا کیا
کیوں تیغ نیم کش کفِ قاتل میں رہ گئی

پروانوں کو وہ چھوڑ کے جاتی بھلا کہاں
رو رو کے شمع بھی تیری محفل میں رہ گئی

یہ انتہائے ضعف تھا پروانوں میں ترک
آواز تک نکل کے سلاسل میں رہ گئی

کچھ ایسی بیخودی تھی کہ لب پر نہ لاسکے
حسرت تو ایک ہی تھی وہی دل میں رہ گئی

اس زورِ ناتوانیٔ دل کا برا ہو شوق
سینے میں ہوک اُٹھ کے مری دل میں رہ گئی

۱۹۱۹ء

کچھ تو مٹے ہوس دلِ حسرت پناہ کی
بس بس ستم نہ ڈھائے لگاوٹ نگاہ کی

ہم حشر پر اٹھا تو رکھیں شکوۂ ستم
کیا ہو جو تو وہاں نہ سنے داد خواہ کی

گم گشتہ دل کو ڈھونڈتا ہے بزمِ یار میں
شامت کچھ آئی ہو مری بیباک نگاہ کی

وہ درد تھا کہ اُف مرے منہ سے نکل گئی
اس پر بگڑ رہے ہیں کہ کیوں تو نے آہ کی

تم مجھ کو بے نیاز ہو دل وقفِ انکسار
صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

رو رو کے دل ڈبوتا ہے کیوں آبروئے عشق
ناآشنا سے کس لیے پہلے ہی چاہ کی

بیٹھے تھے شوق ہاتھوں سے تھامے ہوئے جگر
پوچھا جو حالِ زار تو حسرت سے آہ کی

سنہ ۱۹۱۹ء

مرے پیاسے جو چھوٹا میکدہ اہل حرم ہم سے
علاج تشنہ کامی خاک ہوگا آب زمزم سے

نہ کیوں رنگ بقا بعد فنا باقی ہے ہم سے
مٹانے والے ہیں ہم نقش ہستی اپنا عالم سے

کہاں تک شور و شیون اے عزیزو میرے مرنے پر
اٹھی جاتی ہیں گھبرا کر وہ دیکھو بزم ماتم سے

عدم کے جانے والو کچھ بتا دو تم پہ کیا گذری
کبھی تو واسطہ رکھتے تھے تم بھی اہل عالم سے

یہی تو مدفن عاشق ہے تو بھی ہاتھ اٹھاتا جا
ذرا دم لے ارے او جانے والے بزم ماتم سے

جو ہو مد نظر تم کو تماشہ رقص بسمل کا
تو اوچھے اوچھے کرنا وار شمشیر قضا دم سے

ہمیں دعویٰ تھا درد دل پہ وہ کبھی بنہیں ہوتا
عبث امید رکھتا ہے جہاں میں شوق ہمدم سے

سنہ ۱۹۱۹ء

یہ روندی جاتی ہے کس کی تربت یہ ظلم کس پر پس فنا ہے
بتا تو اے ظالم ستمگر کہ مرنے والے کی کیا خطا ہے

ادا و ناز و ستم کا پتلا کہیں ہم اُن کو تو یہ بجا ہے
نقاب رُخ سے کہیں جو اُلٹے تو دیکھیں کیا صورت حیا ہے

نہیں ہے نامحرم اور کوئی یہ مجھ سے شرم و حجاب کیا ہے
اُٹھاؤ رُخ کو ہٹاؤ پردہ کہاں کی ایسی بڑی حیا ہے

ستا لو جی بھر کے جتنا چاہو کبھی نہ ہم اُف ذرا کریں گے
مگر اتنا تو تم سمجھ یہ رکھو کہ ہم غریبوں کا بھی خدا ہے

ستائے دل کو دکھائے رہنا یہ تیرا ہر دم کا مشغلہ ہے
ذرا سنبھلنے دے مجھکو ظالم ابھی تو درد جگر تھما ہے

بجھائیں دل کی لگی کو کیونکر دکھائیں سوز نہاں یہ کس کو
ہوا کسی سے نہ کچھ مداوا ابھی تو شورش کی ابتدا ہے

چھپے گا کیونکر یہ راز الفت نہ اُف بھی نکلیگی منہ سے کب تک
ہزار آہوں کو ضبط کرلیں مگر ان آنکھوں پہ زور کیا ہے

مٹے ہو کس پر سنیں تو ہم بھی کہ لو لگائی ہے تم نے کس سے
خموش رہتے ہو شوق ہر دم بتاؤ تم کو یہ کیا ہوا ہے

۱۹۲۱ء

دلدادہ چشم مست کا میخوار کون ہے — ساقی یہ تیرے جام سے سرشار کون ہے
دل نے کیا ہے صبر تو آنکھوں نے ضبط اشک — دونوں میں کہدیں آپ گنہ گار کون ہے
کیا بیخودان عشق ہیں مست مئے الست — غافل سبھی ہیں ہم میں سے ہشیار کون ہے
ہم تو فلک کی جان کو پہلے ہی رو چکے — اب پھر ہمارے درپئے آزار کون ہے
مستان عشق سے نہیں آگاہ اہل ہوش — اس رمز بیخودی سے خبردار کون ہے

عشق بتاں میں شوق کی دیکھو تو گمرہی
کعبہ میں اُس کا یاور و مددگار کون ہے

۱۹۲۱ء

صراحی کیوں نہ آتے ہی اے پیر مغاں رکھدی
چھپا کر میرے حصہ کی بتا تو نے کہاں رکھدی

نہ جانے کیا سمجھ کر میں در مسجد تک آیا تھا
یہ کس دھوکے میں میں نے بھی جبیں آ کر یہاں رکھدی

سر تسلیم تو خم تھا تجھے پھر کیا خیال آیا
اُٹھا کر تیغ تو نے کس لیے اے بدگماں رکھدی

فقط یہ دیکھنے کو کرتے ہیں کیونکر نمک پاشی
ہمیں نے قاش دل اک اپنی بہر امتحاں رکھدی

بلائے عشق تو مانگی تھی قسام ازل ہی نے
مگر تو نے بدل کر وہ نصیب دشمناں رکھدی

یہ سرد آہیں تو کچھ بھی سوزش دل کے نہ کام آئیں
بھڑک اُٹھے جو آتش وہ کہاں سوز نہاں رکھدی

کہاں اب جا کے ڈھونڈیں ہم عدم جانے والوں کو
بچاری قیامت پہ تلاش رفتگاں رکھدی

جفائے ناز کا مجھ سے زیادہ کون طالب تھا
اُٹھا کر وہ بھی کس دن کے لیے اے آسماں رکھدی

اُٹھے تو شوق تم ہو روز محشر سرنگوں ہو کر
مگر کچھ یاد ہے فرد گناہ اپنی کہاں رکھدی

۱۹۲۱ء

دل مبتلائے غم ہو تو پھر کیا کرے کوئی
افسردگی میں کس کی تمنا کرے کوئی

الفت میں چشم شوق اگر وا کرے کوئی
بے پردہ اُن کو پردہ میں دیکھا کرے کوئی

تا چند خون آبلہ پا کرے کوئی
کانٹوں کی کیسی پیاس بجھایا کرے کوئی

دیر و حرم میں اب تو ٹھکانا نہیں رہا　　رہنے کو اور گھر کہیں پیدا کرے کوئی
سوزِ دل و جگر پہ نہ کیونکر ہو مجھکو ناز　　ایسا جہاں میں درد تو پیدا کرے کوئی
تو بھی تو منہ چھپاتی ہے آنے میں روزِ ہجر　　اے موت تجھ کو خاک بلایا کرے کوئی
رو رو کے شوق کہتے ہو کیوں داستانِ عشق
کیا ہو یہ سرگزشت جو سمجھا کرے کوئی

۱۹۲۱ء

تنِ بیجاں میں اب رہا کیا ہے　　دیکھئے مرضیٔ خدا کیا ہے
اپنی حالت پہ آج روتا ہے　　دلِ دیوانہ کو ہوا کیا ہے
اے طبیبو تمہیں خدا کی قسم　　سچ بتا دو کہ ماجرا کیا ہے
میں خطاوار ہی سہی لیکن　　سُن تو لو پہلے ماجرا کیا ہے
نہ کھُلا آج تک کسی پہ بھی　　خطِ تقدیر میں لکھا کیا ہے
کیوں یہ چپ چپ گئے عدم والے　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
لبِ زخمِ جگر تو ہنستے ہیں　　تو نے اے بخیہ گر سیا کیا ہے
دل تو کیا جان عشق میں دیدی　　یہ نہ پوچھا کہ مدعا کیا ہے
اُٹھ کے پچھلے سے آہوں کا بھرنا
شوق تیرا یہ مشغلہ کیا ہے

١٩٢١ء

موت کیوں چارہ گر نہیں آتی — شام سے تا سحر نہیں آتی

ہاں۔ نہیں ہے فقط جواب سوال — اتنی سی بات کر نہیں آتی

آج ایسی پلائی ساقی نے — ابتدا کی خبر نہیں آتی

بہرِ تسکینِ دل۔ کوئی تدبیر — تجھ کو اے چارہ گر نہیں آتی

ایک ہچکی میں کام ہو جاتا — وہ بھی اب تا سحر نہیں آتی

ایسے نادان دل سے کیا اُمید — بات تک جس کو کر نہیں آتی

کوچ کر جاتے ہیں جو دنیا سے — کچھ پھر اُن کی خبر نہیں آتی

دل میں رہتی ہے شوق یادِ خدا
دل سے باہر مگر نہیں آتی

١٩٢١ء

کچھ کچھ تشفیِ دلِ نالاں کیے ہوئے — وہ جا رہے ہیں مجھ پہ یہ احساں کیے ہوئے

آتے ہیں زخمیوں کا وہ درماں کئے ہوئے — خالی نمک سے آج نمکداں کیے ہوئے

آہیں لبوں پہ۔ آنکھوں میں آنسو جگر میں درد — بیٹھے ہیں عشق ہم بھی یہ ساماں کیے ہوئے

سیرِ چمن کو آئے تو یہ تازہ گل کھلا! — جاتے ہیں بوئے گل کو پریشاں کئے ہوئے

دل کی تو اضطرابیاں پھر بھی نہ کم ہوئیں — بہلاتے ہم رہے تہ داماں کئے ہوئے

پھر میکدہ کو لے ہی چلا کیفِ بیخودی — توبہ سے دل کو اور پشیماں کیے ہوئے

جو دست کش ہوئے ہیں وہ جور و ستم سے اب
خود ہی جفا کو اپنی پشیماں کیے ہوئے

خلوت میں آئینہ پہ جو گزری کسے خبر
نکلے مگر ہیں اس کو وہ حیراں کیے ہوئے

کل تک مجھے تھا حرمتِ ناموس کا خیال
بیٹھا ہوں آج چاک گریباں کیے ہوئے

کیا جانے دورِ بزم میں افتاد کیا پڑی
جاتے تھے رند سر بہ گریباں کیے ہوئے

اب شوقؔ بت پرست کو دیکھو یہ کیا ہوا
ساتھ اپنے لے گیے وہ مسلماں کیے ہوئے

سنہ ۱۹۲۳ء

سنا ہے ضعف کی ہے نالہ و فغاں کے لیے
کہاں سے لائیں اثر آہِ ناتواں کے لیے

دل و جگر کی جو حالت کو پوچھیگا قاتل
دہانِ زخم ہی کھل جائیں گے بیاں کے لیے

بس اور کیا ہے یہاں آہِ آتشیں کے سوا
لگا رکھا ہے شبِ ہجر آسماں کے لیے

تلاش ہے اسی خونابۂ دل کی تیر کو بھی
چھپائے ہیں جسے ہم چشمِ خونفشاں کے لیے

ہیں ایسا دل جو کبھی ہو نہ دادخواہِ ستم
کہاں سے لاؤں ترے تیرِ خوں چکاں کے لیے

جفائے دہر کا شکوہ کریں نہ اہلِ وفا
یہ وقف ہیں ستم و جورِ آسماں کے لیے

کسے حیاتِ دو روزہ کی شوقؔ ہے پروا
بتوں پہ مرتے ہیں ہم عیشِ جاوداں کے لیے

سنہ ۱۹۲۱ء

ہجر میں دردِ جگر خون رلاتا ہے مجھے
دل کا کچھ رنگ دگرگوں نظر آتا ہے مجھے

کون سا غم ہے جو اک یاد دلاتا ہے مجھے
اپنی ہستی ہی کے عالم پہ رلاتا ہے مجھے

چپ ہی بیٹھے رہو ہمت کو بڑھاتی کیا ہو
درد دل اٹھ کے تو کچھ اور ستاتا ہے مجھے

ایک میں یاد زمانے کی جسے رہتی ہے
اک زمانہ کہ زمانے سے بھلاتا ہے مجھے

میری ہستی کی حقیقت یہ ہے اس کے آگے
ہوں میں اک حرف غلط لکھ کے مٹاتا ہے مجھے

ناتوانی کا یہ عالم ہے یہ ہے ضعف کا حال
در و دیوار کا سایہ بھی دباتا ہے مجھے

تاب رفتار کہاں، منزل مقصود کہاں
جذبۂ شوق ہی کھینچے لیے جاتا ہے مجھے

دل ٹھہر جائے تو کھل جائے حقیقت ساری
کوئی تو ہے پس پردہ کہ بلاتا ہے مجھے

میں وہ ہوں نام بھی اٹھنے کا نہیں لیتا ہوں
شور محشر ہے کہ آ آ کے جگاتا ہے مجھے

رات کو خواب نظر آتے ہیں چونک اٹھتا ہوں
سایۂ شاخ گل ۔ افعی نظر آتا ہے مجھے

شوق کیا خواب گراں کی ہو گرانی معلوم (غالب)
تھپکیاں دے کے کوئی آج سلاتا ہے مجھے

۱۹۲۳ء

کچھ تو ہو درد کی لذت ہی سہی
تیری الفت میں اذیت ہی سہی

درد کو درد نہ جب تو سمجھے
بدگمانی تیری عادت ہی سہی

دل مہجور میں ارمان وصال
نہ سہی دید کی حسرت ہی سہی

بت کدہ چھوڑنے والے تو نہ تھے
خیر ملتی ہے تو جنت ہی سہی

دل کو تھا خاک میں ملنا سو ملا
دیکھنے والوں کو عبرت ہی سہی

اُس ستمگار نے کر لی توبہ! — اے فلک ہاں کوئی آفت ہی سہی
کوئی جلوہ نظر آئے شاید — ٹکٹکی بندھنے کی عادت ہی سہی
ہیں کسی جلوے کی آنکھیں مشتاق — کچھ کم و بیش یہ غفلت ہی سہی

عشق کی بولتی تصویر ہے شوق
دیکھنے والوں کو حیرت ہی سہی

سنہ ۱۹۲۱ء

دھواں منہ سے دیکھو نکلتے ہوئے — نہ دیکھا ہو گر دل کو جلتے ہوئے
دوا ہو چلا ہے وہ دردِ آشنا — میں رُکتا ہوں اب دل بدلتے ہوئے
عجب آنسوؤں کا بھی انداز تھا — وہ آنکھوں میں آنا مچلتے ہوئے
سمجھیں ... دل کا پتہ جب چلے — اگر شمع دیکھو پگھلتے ہوئے
بھرے بیٹھے ہیں آنکھوں میں طفلِ اشک — نہ چھیڑو کہ نکلیں مچلتے ہوئے
وہ ہی مدفنِ عاشقِ بدنصیب — چلے آیئے گا ٹہلتے ہوئے
تڑپتا ہے بسمل تڑپنے بھی دو — نہ دیکھو اُسے رُخ بدلتے ہوئے
کہاں ہیں ترے تیر او مستِ ناز — سنا ہے غضب کے ہیں چلتے ہوئے

کہاں شوق اُس دل کو لیجائیں ہم
نہ دیکھا ہو جس کو بہلتے ہوئے

سنہ ۱۹۲۲ء

چوٹ قسمت سے دل پہ کھائی تھی — یہ بھی افتادِ ناگہانی تھی
سرگزشتِ بلاکشانِ عشق — جھوٹی سچی سی اک کہانی تھی
خواہشِ سیرِ کوچۂ قاتل — ہوسِ مرگِ ناگہانی تھی
کیسے جور و جفا سے گھبراتے — بندہ پرور کی مہربانی تھی
مرنا جینا تھا اپنے ہی ہاتھوں — وہ بھی کیا خاک زندگانی تھی
اُسی کوچہ سے لے چلے احباب — مدتوں جس کی خاک چھانی تھی

سنتے تھے آپ شوق سے جس کو
شوقؔ ناکام کی کہانی تھی

سنہ ۱۹۲۲ء

جگر میں ہوک اُٹھنا تھی اُٹھا کی — دوا کیا کرتے دردِ لادوا کی
جفا جو بن کے ظالم نے حیا کی — اُٹھا کر تیغ رکھدی کیا جفا کی
ہوا جور و ستم کا دل نہ شاکی — جفا کی آپ نے ہم نے دعا کی
ستم سے بھی ہمیں محروم رکھا — جب اُن سے خواہشِ جور و جفا کی
مریضِ عشق کا انجام دیکھا — عبث اے چارہ گر فکر دوا کی
ہزاروں منّتیں بھی کر کے دیکھا — نہ بر آئی دلِ بے مدعا... کی
خودی سے ہیں خدائی بھر میں گمراہ — کہیں کیا بات نہیں سنتے خدا کی

زباں میری نہ کھلواؤ خدا را   تمھیں کہہ دو کبھی تم نے وفا کی
بتوں سے شوق کیا اظہار کرتے
ہمیں عادت نہیں ہے التجا کی

۱۹۲۲ء

بھلا ہو تمھارا صدا کر چلے   دعا کر چلے ہم۔ دعا کر چلے
وہ بیمار دل کو دکھا کر چلے   مرض کی یہ اچھی دوا کر چلے
وہ دل خاک میں کیا ملا کر چلے   مرا نقش ہستی مٹا کر چلے
ستم کر چلے یا جفا کر چلے   کوئی اُن سے پوچھے یہ کیا کر چلے
تمھیں ہو یقیں یا نہ ہو دیکھئے   کہ ہم مرتے مرتے وفا کر چلے
ہماری خطا ہو تو ہم بھی سُنیں   کسے آپ رو کھی سُنا کر چلے
اثر آپ کے دل پہ ہو یا نہ ہو   حقیقت جو تھی ہم سُنا کر چلے
خطا دل کی تھی میں نے مانا مگر   تمھارے بھی تیرا ب خطا کر چلے
جو کرنا تھا اے شوق وہ بھی کیا؟
کہ آئے تھے کیوں اور کیا کر چلے

۱۹۲۲ء

دیکھ لی ہم نے بے رخی دل کی   اب نہ مانیں گے ہم کبھی دل کی
سوزِ الفت کی قدر جب ہوتی   کاش تم جانتے لگی دل کی

ساتھ صبر و قرار چھوڑ گئے
ایک ہمدم ہے بیکسی دل کی

ایک دو آہ کھینچ لے شاید
اتنی ہے اور زندگی دل کی

مرمٹوں کو تو کوئے جاناں میں
کاش گم کرتی نیستی دل کی

آگ لگ جائے اس محبت کو
کیا بُری ہوتی ہے لگی دل کی

مسکنِ یار خانۂ دل ہے
کہہ رہی ہے یہ بیخودی دل کی

دیکھئے جامہ سے ہوئی باہر
مجھ سے بڑھ کر ہی بیخودی دل کی

طے کرو شوق راہِ الفت کو
رہنما ہوگی گمرہی دل کی!

۱۹۲۷ء

وہ شوخی بھی شرم و حیا ہو گئی
بڑھی کچھ تو تیغِ ادا ہو گئی

حرم چھوڑ کر دیر کا ہو رہا
مرے دل کی قسمت رسا ہو گئی

کھلا کچھ نہ رازِ تجلیِ حسن
زمیں طور کی سرمہ سا ہو گئی

دلِ بیوفا پہ بھروسہ کیا
خطا ہو گئی ہاں خطا ہو گئی

حسینوں کی پابوس ہونے لگی
بہت شوخ پس کر حنا ہو گئی

تمھیں سچے صاحب ہیں جھوٹا سہی
چلو ہم نے مانا خطا ہو گئی

یہ غفلت کی نیندیں خدا کی پناہ
نمازِ سحر بھی قضا ہو گئی

مرے سوز پہ شمع شب بھر جلی
سحر ہوتے ہوتے فنا ہو گئی

دلِ شوق کا کوئی پُرساں نہیں
نگاہِ بتاں کیا سے کیا ہوگئی

سنہ ۱۹۲۷ء

دیکھا جو چمن میں تو ہی تو ہے
ہر غنچہ و گل میں تیری بُو ہے

جوشِ بحر فنا نہ پوچھو
آب شمشیر تا گلو ہے

اشکوں کو گرا دیا نظر سے
کیا دیدۂ تر کی آبرو ہے

ہی ہوش کسے خبر کسے ہے
ساغر ہے کدھر کدھر سبو ہے

رشکِ گلشن ہے تیرا دامن
ہیں پھول کہ جا بجا لہو ہے

اپنی ہی خبر نہیں ہے ہم کو
بیکار کسی کی جستجو ہے

رہنے دو کھلا ہی چاکِ دل کو
کب اس میں حاجتِ رفو ہے

لایا کیا رنگ خونِ ناحق
غنچہ بھی لہو سے سرخ رو ہے

بدنام ہوئے جو عشق میں شوق
الفت میں یہ ہی تو آبرو ہے

سنہ ۱۹۳۲ء

دل کہاں تھا جو ہم فدا کرتے
رہ گئے دنیا میں کیا وفا کرتے

جاں نثاروں کو قتل کرنا تھا
زندگی بھر تمھیں دعا کرتے

اک قیامت گزر گئی شب ہجر
رات کاٹی خدا خدا کرتے

موت آ کر جو ہاتھ پھیلاتی
جان دیدیتے اور کیا کرتے

جان دیتے ہی بن پڑی آخر
اور کیا ترکِ مدعا کرتے

نہ اُٹھی وہ نقابِ رُخ نہ اٹھی
تھک گئے ہونٹ التجا کرتے

تھا وہ آنکھوں میں دیکھنا تھا جسے
چشم کیا وقتِ مرگ وا کرتے

بے زبانوں کی بھی کبھی سُن لو
عمر گزری انھیں صدا کرتے

ہم تھے پابندِ عشق دنیا میں
کیا غمِ ترکِ ماسوا کرتے

دل میں احساس ہی نہ تھا باقی
درد ہوتا تو کیا دوا کرتے

جاتے کعبہ میں بت پرستی کو
یہ بھی اک فرض تھا ادا کرتے

شوق پھر لطفِ سوزشِ دل تھا
شعلے اُٹھ اُٹھ کے خود بجھا کرتے

١٩٣٢ء

دُھواں اُٹھتا ہے جام و ساغر سے
آگ برسے گی آتشِ تر سے

ہم تو آئے تھے دور سے ساقی
رہے محروم دورِ ساغر سے

خوب چوسی رگِ گلو نے زبان
پوچھ لو تم دہانِ خنجر سے

ہونے والی جو ہے نہیں ٹلتی
کوئی شکوہ نہیں مقدر سے

دور کتنی ہے منزلِ مقصود
پوچھنا رہ گیا یہ رہبر سے

مرنے والو یہ شرم ہی کیسی
سوتے ہو منہ چھپائے چادر سے

مجھ تک آیا جو دورِ صہبائی — گر گئی مے چھلک کے ساغر سے
شوقؔ بیداد کی شکایت کیا
شکوہ جو رہے ستمگر سے

سنہ ۱۹۳۲ء

دم میں خنجر کی روانی دیکھ لی — چلتی پھرتی سخت جانی دیکھ لی
صورتِ دل بستگی دیکھی نہیں — دیکھ لی دنیائے فانی دیکھ لی
جب گئے گورِ غریباں کی طرف — مرنے والوں کی نشانی دیکھ لی
ہو گئیں سب آرزوئیں پائمال — خاک میں ملتی جوانی دیکھ لی
مٹ گیا نام وفا بھی دہر سے — یہ جفا کی مہربانی دیکھ لی
سارے گلشن میں لگا دی اُس نے آگ — آہ کی اخگر فشانی دیکھ لی
اے ستم کیش آفریں صد آفریں — سب نے تیری بد زبانی دیکھ لی
سر میں سودائے جنوں ہی اور ہم — گرمیِ عشقِ نہانی دیکھ لی
سرنگوں اے شوقؔ کیوں بیٹھے ہو تم
چار دن کی زندگانی دیکھ لی

سنہ ۱۹۳۲ء

لوٹ آئے جلوہ گاہِ یار سے — کچھ نہ دیکھا دیدۂ بیدار سے
اُس کی کیا تھی آرزوئے آخری — تم نے پوچھا تک نہیں بیمار سے

میرے زخمِ دل زباں رکھتے نہ تھے
بات کیا کرتے لبِ سوفار سے

جلتے دیکھی جبکہ شاخِ آشیاں
سارے تنکے گر گئے منقار سے

تشنگی سی تشنگی تھی ساقیا
کچھ بجھی ہاں بادۂ سرشار سے

ہی وفورِ شوقِ دل پر رعبِ حسن
بات کیا نکلے لبِ اظہار سے

اشتیاقِ بارگاہِ حسن میں
بڑھ گئے کچھ منزلِ دشوار سے

شوق تم کو وہ زمانہ یاد ہے
واسطہ تھا خانۂ خمار سے

سنہ ۱۹۲۱ء

کچھ نہ پوچھو جو مزہ شوخیِ تقریر میں ہے
بات کچھ اور ہی خاموشیِ تصویر میں ہے

بے زباں زخم بھی دیتے ہیں دعائیں تجھکو
ہم نہ رکھتے تھے یہ جوہر تری شمشیر میں ہے

چھپاتی وحشتِ دل بھی ہے جو کڑیاں سہ کر
کوئی تو سلسلہ ایسا مری زنجیر میں ہے

جل بجھی شمع مگر اُس کی زباں تک نہ ہلی
پھر یہ کیوں اُس سے عداوت دلِ دلگیر میں ہے

انتشارِ دلِ ناشاد الٰہی توبہ
جابجا رنگ بھی اُڑتا ہوا تصویر میں ہے

لطفِ گویائی سے ہے ذوقِ خموشی بڑھکر
بے زبانی کا مزہ آپ کی تصویر میں ہے

خون تھوکا کئے یہاں تک سرِ مقتل اُس نے
کچھ بھی باقی نہ سکت اب دمِ شمشیر میں ہے

شوق تم اپنا خطِ شوق اُنھیں بھیج تو دو
وہ تو ہوتا ہی جو لکھا ہوا تقدیر میں ہے

۱۹۲۱ء

دل کو بسمل کیا جس نے وہ ادا کس کی ہے
کیا کہیں کہہ نہیں سکتے یہ جفا کس کی ہے

آنکھوں آنکھوں میں جو کہتے ہو کوئی کیا سمجھے
خود نما وہ نہیں در پردہ حیا کس کی ہے

دیکھنا کشتۂ حسرت کا بھی مدفن ہے یہاں
خاک اڑاتی ہوئی پھرتی یہ صبا کس کی ہے

باوفاؤں میں تو شکوے کی کوئی رسم نہیں
ہم سے کیا پوچھتے ہو تم کہ جفا کس کی ہے

دل نے چاہا انہیں بیداد مگر ہے مجھ پر
مجرم عشق ہوا کون سزا کس کی ہے

دل جگر دونوں لڑے مرتے ہیں اک پیکاں پر
شوقؔ کچھ تم نہیں کہتے کہ خطا کس کی ہے

۱۹۲۳ء

مستانے سب جمع ہوئے ہیں لاؤ کچھ کام چلے
خیر ہے میخانہ کی ساقی دور جام چلے

نشہ میں بھولیں اپنی ہستی مستی میں کچھ کام چلے
یاد میں عمر رفتہ کی پیمانہ چھلکے کام چلے

دل کو ہم نے اپنا جانا ہم سے خطا یہ فاش ہوئی ہے
دھوکا جو دے وقت پہ ہم کو ایسے سے کیا کام چلے

ہم ہیں اور یہ کنج قفس ہے بلبلو تم کو مبارک گلشن
ہم تو اب صیاد کے ہاتھوں ہو کے اسیر دام چلے

آئے تھے کس کام سے تم اے مرنے والو دنیا میں
اہل عدم کو بہر نجات کو لیکر کیا پیغام چلے

خم کا صدقہ کچھ تو پلا دے تجھ سے منت کرتے ہیں
حلق میں کانٹے خشک پڑے ہیں لا میرے ساقی جام چلے

کیا ہے مریض غم میں باقی بچنے کی کچھ آس نہیں
جینے کا افسوس ہے کیا ہے بستر سے صبح چلے یا شام چلے

لہو و لعب میں عمر گنوائی دین و دنیا کھو بیٹھے
حسرت باقی رہ گئی دل میں کیسے ہم گمنام چلے

آہ وہ بکا تھی کس کے دل کی ہائے ستایا کس کا تھا
رہ رہ سن کر حسن کا شیون اپنا کلیجہ تھام چلے

فیض شہیدِ ماہر فن سے شوق نے بزمِ اہلِ سخن میں
پیش کئے ہیں دل کے ٹکڑے شاید ان سے کام چلے

سنہ ۱۹۲۳ء

عجب لذتِ دلِ اندوہ گیں معلوم ہوتی ہے
مژہ کی نوک جس دم دلنشیں معلوم ہوتی ہے

کہاں تک جائیں آخر نالۂ دل ناتوانوں کے
کوئی حد بھی تری چرخِ بریں معلوم ہوتی ہے

جہاں پہلی ترا تیرِ نگاہِ ناز گزرا تھا
خلش اب تک مرے دل میں وہیں معلوم ہوتی ہے

بتا اب کس سے آنسو پونچھوں میں اے پنجۂ وحشت
نہ دامن نہ مجھکو آستیں معلوم ہوتی ہے

تری چشمِ فسوں گر نزع میں پڑتی ہے جب مجھ پر
طرف دارِ نگاہِ واپسیں معلوم ہوتی ہے

رگِ بسمل کی خوننابہ فشانی کا بھی کیا کہنا
بھلی کیسی یہ رنگیں آستیں معلوم ہوتی ہے

پڑی ہیں نالۂ موزوں سے کیا ہونٹوں پہ چھالے
شرر افشاں کچھ آہِ آتشیں معلوم ہوتی ہے

وہ خود کردہ پشیماں ہیں نہ چھیڑو شوق جانے دو
حجاب آلودہ چشمِ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

سنہ ۱۹۲۱ء

تھک گئے ہم تو دلِ ناداں کو سمجھاتے ہوئے
آپ لیجائیں اُسی باتوں میں بہلاتے ہوئے

وقتِ رخصت ہو گیا بیتابی دل میں سکوں
ہاتھ رکھکر سینہ پر گیا کہدیا جاتے ہوئے

دھجیاں دامن کی کچھ رہنے دی اے دستِ جنوں
خارِ صحرا کو پھر ہیں گے ان سے الجھاتے ہوئے

جان بلب بلبل ہے یہ تیرا تغافل ہے ستم! — دیر کیا لگتی ہے ظالم دم نکل جاتی ہوئی
آئے بھی کیا سوچ کر دل میں عیادت کو مری — کیا سمجھ کر اب پھری جاتی ہو چھپاتی ہوئی
بس بہ بعض غم تری تیمارداری ہو چکی — اٹھ گئے گھبرا گئے وہ یہ مجھ سے فرماتی ہوئی
جز ہجوم یاس و حسرت اور کیا ہوگا وہاں — غنچۂ دل کو کوئی کیا دیکھے مرجھاتی ہوئی
دل کی اب افسردگی کا رنگ ہے سب سے الگ — کھلے کلیوں کو بھی دیکھا ہے مرجھاتی ہوئی

شوق اب بھی خواب غفلت سے ذرا بیدار ہو
دن گزر جائینگے یہ بھی یونہیں چھپاتی ہوئی

۱۹۲۰ء

اگر وہ پردہ نشیں بےحجاب ہو جائے — نیا زمانہ میں اک انقلاب ہو جائے
ہمارے جام سفالیں کو بھر دے اے ساقی — ادھر بھی بھولے سے دور شراب ہو جائے
تمہیں جفا پہ ہے غرہ ہمیں وفا پہ ناز — خدا ہی ہے جو حساب کتاب ہو جائے
اجل سے کوئی کہا نتک اب انتظار کرے — جو کچھ بھی ہونا ہو ظالم شتاب ہو جائے
کسے دکھائیں ہم اس بدنصیب کی حالت — جو اپنے ہاتھوں سے خود ہی خراب ہو جائے
وہ جلوہ گر سر محفل ہوں بےحجابانہ — ہجوم تار نظر خود نقاب ہو جائے

بڑھی ہے شام شب وعدہ بےقراری شوق
عجب نہیں ہے جو وہ کامیاب ہو جائے

سنہ ۱۹۲۰ء

جس دم اشارے چشم فسوں گر کے ہو گئے — ارماں حصول سب دل مضطر کے ہو گئے

جور و ستم سے عادتِ مشقِ ستم بڑھی — بت سنگدل تھا اور بھی پتھر کے ہو گئے

وہ دم نہیں وہ تیزی رفتار اب نہیں — کیا ختم حوصلے تری خنجر کے ہو گئے

ساقی کی چشم مست نے دل چور کر دیا — سو ٹکڑے اک نگاہ سے ساغر کے ہو گئے

اہلِ وفا کے خون سے کچھ بھی نہیں دریغ — جوہر عیاں سب آپ کے خنجر کے ہو گئے

کیوں شوق ہم نہ کہنے بھی نکلا نہ منہ سے کچھ
اُس سنگدل کے سامنے پتھر کے ہو گئے

سنہ ۱۹۲۰ء

دل کی جس دم خستہ حالی جائے گی — جو پڑے گی وہ اُٹھا لی جائے گی

اک لہو کی بوند بھی نہ لگا نہ دل — نوکِ نشتر جب نکالی جائے گی

اے دل مضطر ٹھہر کچھ صبر کر! — اک نظر تجھ پر بھی ڈالی جائے گی

اضطراب دل کو بس رہنے بھی دو — اُس کی حالت کیا سنبھالی جائے گی

کچھ خلش سی کیا عجب باقی رہے — پھانس دل کی جب نکالی جائے گی

کیوں ابھی سے چھوڑ دیں مہر بتاں — بات موقع پر بنا لی جائے گی

شوق تم کو کچھ خبر ہے روز حشر
فردِ عصیاں دیکھی بھالی جائے گی

سنہ ۱۹۲۱ء

جسم میں ہے روح زندانی مری — پوچھتے کیا ہو پریشانی مری

دل کو گیسو میں چھپا کر رکھ تو لو — دیکھنا پھر تم پریشانی مری

لے چلی ہے مجھکو بزم یار میں — رنگ لائے گی پریشانی مری

دل کو شوق خار صحرائے جنوں — اور اس پر حیف عریانی مری

سنتے سنتے آپ گھبرا جائیں گے — داستان غم ہے طولانی مری

مل گئے مٹی میں سب ذرات دل — خاک کوئے یار ہے چھانی مری

سوزش دل روز سے افزوں ہوئی — کام آئی اشک افشانی مری

کھینچ کر خنجر اگر وہ آئیں گے — آڑے آئے گی گراں جانی مری

عرض مطلب پر وہ بگڑے تھے مگر — راہ پر لائی پشیمانی مری

شوق نے تو کہہ دیا ہے بارہا
جامۂ ہستی ہے عریانی مری

سنہ ۱۹۲۵ء

یہ زندگی دو روزہ بھی ہے قضا کے لیے — فنا ہے میرے لیے اور میں فنا کے لیے

نہ پہونچے تا بہ فلک ان کی بام تک ہی سہی — یہی بہت ہے مری آہ نارسا کے لیے

ہیں اور تم کو کہوں بے وفا معاذ اللہ — بہانہ ڈھونڈھ رہے ہو عبث گلہ کے لیے

یہ اشتیاق شہادت تھا دل کو مدت سے — تڑپ تڑپ کے جو اس نے قدم قضا کے لیے

نقابِ رُخ سے اُلٹ دو تو پھر بلائیں لوں — تم اور ڈھونڈنا حیلہ کوئی حیا کے لیے
وہ بول اُٹھے کہ لو کرتے ہیں وہ مِرا شکوا — اُٹھائے ہاتھ جو میں نے کبھی دعا کے لیے

دیا نہ موقع اظہارِ حالِ شوق مجھے
کبھی نہ حکم ملا عرضِ مدعا کے لیے

۱۹۲۳ء

تیری مست آنکھوں میں کیف مئے انگور رہے — ساقیا ہوش رہا نہ نرگسِ مخمور رہے
ایسے بیمار کی کیا حسرتِ دل کا ہو بیاں — سانس لینے سے بھی افسوس جو مجبور رہے
لذّتِ دردِ نہاں میں نہ کمی پیدا ہو — کوئی پیکاں تو چھپا اے دلِ رنجور رہے
ایک دل نالہ کناں رہتا تھا وہ بھی نہ رہا — کون اب ہو جو شریکِ غمِ مہجور رہے
کونسی بات نہ تھی کوئے بتاں میں حاصل — دیکھو موسیٰ کو کہاں جا کے سرِ طور رہے
روزِ محشر بھی نہ آیا ہمیں اُٹھنے کا خیال — ساقیا کونسی مے تھی کہ جو ہم چور رہے
بیخودی میں بھی انا الحق ہی پکارو اُٹھکر — ہوش اتنا مجھے پی کر مے منصور رہے
دلِ پرخوں کا وہ عالم ہو کہ جیسے سرِ خم — مے احمر سے پیالہ کوئی معمور رہے
جی میں ہو اُس کو بھی میں سینہ میں اپنے رکھ لوں — کیوں مرے دل سے ترا تیرِ نظر دور رہے

بن پڑی شوق نہ کچھ عشقِ بتاں میں تم سے
پیش کیا آئی جو تم عاجز و مجبور رہے

۱۹۲۳ء

شوق کچھ کہتا ہے دل سے اور دل مجبور ہے
بس ہوں بیٹھا پاؤں توڑے اور منزل دور ہے

میں سزاوارِ خطا ہوں اور دل ہے بیخطا
سچ بتا دو تم مجھے اب کیا تمہیں منظور ہے

کہہ رہی ہے مجھ سے چشمِ ساقئ بزمِ ازل
کونسی وہ مے تھی جس کا اب بھی تو مخمور ہے

کوئی سرگرمِ فغاں ہے اور کوئی خندہ زن
یہ تری محفل میں دیوانوں کا کیا دستور ہے

دیر و کعبہ مسجد و بتخانہ سب دیکھا مگر
کچھ نہ سمجھے پردہ اخفا میں کیا مستور ہے

نقدِ دل ہے نذر رکھیے داشتہ آید بکار
اک فقیرِ بے نوا کا بس یہی مقدور ہے

شوق گو خستہ جگر ہے باغِ عالم میں مگر
بلبلِ رنگیں بیاں شیریں سخن مشہور ہے

۱۹۲۳ء

خفتگانِ بخت کو بیدار رہنے دیجیے
اپنے دیوانوں کو کچھ ہشیار رہنے دیجیے

سو طرح کے فتنے اٹھنے کا ہے ڈر اس چال سے
بیٹھیے بھلی آپ یہ رفتار رہنے دیجیے

کفر و دیں دونوں کا رشتہ تا بہم قائم رہے
سبحہ و تسبیح میں زنار رہنے دیجیے

رفتہ رفتہ ہو گیا ہوں خوگرِ جور و جفا
دل اگر ہے درپئے آزار رہنے دیجیے

نرگسِ شہلا کا جادو مجھ پہ کیوں چلتا رہے
چشمِ فتاں کا مجھے بیمار رہنے دیجیے

کیوں اسے اس طرح سے ہونے دوں پامالِ ستم
اپنے دل کا خود مجھے مختار رہنے دیجیے

شوقؔ مرد باوفا ہی نذر کو لایا ہے دل
تحفہ ناچیز ہے سرکار رہنے دیجیے

سنہ ۱۹۲۴ء

اور بھی زخم جگر جوش میں خنداں ہونگے
کئی خالی ابھی قاتل کے نمکداں ہونگے

ہم جو صحرائے جنوں میں کبھی مہماں ہونگے
اے غریب الوطنی کیا ترے احساں ہونگے

ننگ آتی ہی مدد ہمت مردانہ دل
سنتے ہیں حشر کے میدان میں عریاں ہونگے

ہم پرستار بتاں دیر سے کب اُٹھتے ہیں
کعبہ جو جاتے ہیں وہ اور مسلماں ہونگے

ہمصفیران چمن آؤ کریں سیر بہار
آخر اک روز تو ہم داخل زنداں ہونگے

آشیاں دیکھنے کی ہے ابھی حسرت باقی
منتظر ہم ہیں کہ وا کب در زنداں ہونگے

کہو دزدیدہ نگاہوں سے کہ ڈھونڈیں تو سہی
دل جگر دونوں ہیں پنہاں کئی پیکاں ہونگے

دیکھ لینگے جو کبھی جلوہ جاناں کی جھلک
خود ہی جذبات دلی سلسلہ جنباں ہونگے

چھوڑ کر ہم کو کہاں جائیگی تو اے شب ہجر
جستجو میں تری وابستہ حرماں ہونگے

بندہ عشق زمانہ میں بہت ہیں اے شوقؔ
ہم سے پیدا نہ کہیں کشتہ ارماں ہونگے

سنہ ۱۹۲۴ء

تیری دیوانوں کو تھی جستجو قید سلاسل کی
ہر اک نے راہ لی جوش جنوں میں ہی منزل کی

ٹھہر جاؤ کہاں منہ موڑ کر جاتے ہو مقتل سے
سنے گا کون آخر اب تمھاری نیم بسمل کی

وہ ہوں گم کردہ راہِ طلب اس ارزانی میں
نشانی ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں گم کردہ منزل کی

کیا اظہارِ دردِ دل خموشی نے اشاروں میں
مگر سمجھا نہ کوئی بات دیوانوں میں غافل کی

بہت دشوار ہے مشکل ہو آساں سرفروشوں کی
نگاہ بدلی نظر آتی ہے کچھ مقتل میں قاتل کی

خزاں آئی ہوا خالی گلوں سے گلشنِ عالم
فضا جاتی رہی رونق نہیں اگلی سی محفل کی

نکلنا بار ہوا ای شوق زندانِ محبت سے
کہ الفت ہو گریباں گیر اب طوق و سلاسل کی

۱۹۲۳ء

وقتِ آخر دید کی حسرت نہ بسمل میں رہے
آپ آجائیں تو کچھ باقی نہ پھر دل میں رہے

جلوہ گر ہر دم محبت یار کی دل میں رہے
لیلیٰ حجلہ نشیں پوشیدہ محمل میں رہے

پائے قاتل پر نہ تڑپے گا یہ کھائی ہے قسم
دیکھیں کب تک طاقتِ ضبط اس کے بسمل میں رہے

آشیاں ہو یا قفس فصلِ خزاں ہو یا بہار
شکوہ گلچیں مگر شورِ عنادل میں رہے

وہ دو باتیں ان سے ہونگی ای ہجومِ آرزو
بیخودی میں کیا زباں سے نکلے کیا دل میں رہے

یہ دلِ ناشاد ہے ہنگامہ خیز انجمن
اس کو جانے دیجیے کیوں اہلِ محفل میں رہے

کیا خبر تھی دشمنِ جاں بیخودی ہو جائیگی
مدتوں وہ جلوہ آرا دیدۂ دل میں رہے

میکدہ میں جب نگاہ مست ساقی پڑ گئی
میکشو کیا جام خالی دستِ سائل میں رہے

جز گنہگاری کمایا کچھ نہ عقبیٰ کے لیے
شوق وقتِ آخری تحصیل حاصل میں رہے

۱۹۲۳ء

تھم تھم کے ہاتھ سینے سے اپنا اٹھائیے
پھر درد دل کو بہر تماشا اٹھائیے

کیوں دل کے ساتھ عشق کا افشائے راز ہو
در پردہ یوں نہ حسن کا پردہ اٹھائیے

دم گر نکل رہا ہے نکلنے بھی دیجیے
احسان مرتے دم نہ کسی کا اٹھائیے

اب ان بتان دیر کو پوجیں گے کچھ دنوں
مسجد سے چلیے اور مصلّے اٹھائیے

تقدیر جس کی پلٹی ہو تدبیر ہے عبث
ہاتھ اب مریض غم سے مسیحا اٹھائیے

رہتا ہے نقش پا کی طرح کوئے یار میں
کیوں سر پہ خاک جادۂ صحرا اٹھائیے

ہوتی ہے بیخودی کی بھی اے شوق انتہا
مستی بھری ان آنکھوں سے پردا اٹھائیے

۱۹۲۴ء

خدا جانے تری شیون میں کیا تاثیر ہوتی ہے
سحر کب دیکھیے اے نالۂ شبگیر ہوتی ہے

کہاں تک خاکساروں سے بچیں گے آپ یہ کھنچ کھنچ
کہ مرٹنے پر ان کی خاک دامنگیر ہوتی ہے

سلا دیتی ہے اوروں کو مگر مجھ کو تو اے قاتل
حیات افزا ہوائے دامن شمشیر ہوتی ہے

رہائی پر نہیں جب دسترس ہوتا اسیروں کا
تو شور انگیز اُن کے پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے

ازل سے شکل ناکامی ہی جس کو دیکھتے گزری
وہ کیا جانے کہ کیسی صورت تدبیر ہوتی ہے

نشان قبر تک بھی بعد پامالی نہیں ملتا
اسیر عشق کی کیا اور بھی تعزیر ہوتی ہے

وہ ایسا درد کیا ہے جس کا اخفا ہمدموں سے ہے
صدائے شوقِ غمگیں کس قدر دلگیر ہوتی ہے

۱۹۲۴ء

عجب کیا ہے مرا قاتل بھی بہرِ امتحاں آئے — ذرا کہہ دو ابھی ٹھہرے نہ مرگِ ناگہاں آئے
کدھر کو جانے والے تھے بھٹک کر ہم کہاں آئے — عدم کو چھوڑ کر ہستی میں زیرِ آسماں آئے
کروں تھم تھم کے نالے لب پہ کھنچ کھنچ کر فغاں آئے — مزہ جب ہے کہ دلِ سوزاں سے رک رک کر دھواں آئے
میں وقفِ یاس و حرماں ہوں بلا آئے تو آنے دو — مری ہوتی ہوئی کیوں وہ نصیبِ دشمناں آئے
چمن سے واسطہ کیسا قفس سے اب تعلق ہے — ہمیں کیا وہ بہار آئے کہ گلشن میں خزاں آئے
نہ حسرت ہے نہ ارماں ہے نہ اب سوزِ نہاں باقی — یہ کس کو اور رونا تھا جو اشکِ خوں فشاں آئے
اثر کچھ آہِ آتشناک کا تم نے نہیں دیکھا — فلک ہو خاک جل کر لب پہ گر سوزِ نہاں آئے
میں شوقِ بزمِ لاہوتی سے خوش ہو کر یہ کہتا ہوں — زمیں پر چار طاق افگن کہاں سے آسماں آئے
اسیری میں تو بھولے بیٹھے ہیں طرزِ نوا سنجی — قفس میں کیوں نہ ہر دم یادِ اندازِ فغاں آئے

پھرے جب شوق بیت اللہ سے محرومِ نظارہ
صدا بت خانہ سے آئی یہاں آ ہی

۱۹۲۴ء

کسی کا یارب دلِ شیدا مرا شیدائی ہے — کون سا جلوہ ہے جس کا یہ تماشائی ہے
نہ وہاں نالۂ عشاق کی شنوائی ہے — نہ یہاں دل میں مری تاب شکیبائی ہے

ذرہ ذرہ سے عیاں طاقت گویائی ہے
آپ کے نقش قدم کی یہ مسیحائی ہے

جلوۂ حسن بتاں سے ہے یہ ظاہر ہوتا
پس پردہ بھی ترے حسن کی رعنائی ہے

آئینہ خانہ میں وہ دیکھ چکے مثل اپنا
اور اس پر بھی ابھی دعوئ یکتائی ہے

صرف شمشیر ہی قاتل کے نہیں ہے مگر
ساتھ اپنے وہ قضا کو بھی لگا لائی ہے

بندۂ عشق کو اے شوقؔ نہیں کچھ پروا
لاکھ کوئی کہے دیوانہ ہے سودائی ہے

۱۹۲۱ء

کلیجہ منہ کو آتا ہے دل ناشاد رہنے دے
مزاج یار نازک ہے ابھی فریاد رہنے دے

وہ ہو یاد بتاں یا شور ہو حق دیر و مسجد میں
مجھے قید مکاں سے اے جنوں آزاد رہنے دے

نہ پوچھ اے ہمنشیں کیونکر نشیمن چھٹ گیا مجھ سے
اسیر تازہ میں ہوں اب تو یہ روداد رہنے دے

بلا سے خاک میں ملتا ہے ملنے دے تجھے کیا ہے
غبار ناتواں کو اے صبا برباد رہنے دے

نکل کر اب کہاں جاتی ہے آہ جاں گزا تو بھی
ترا مسکن دل پر درد ہے آباد رہنے دے

گرفتاران الفت کو قفس ہے آشیاں ظالم
جو پابند محبت ہیں انہیں آزاد رہنے دے

وفا کا پاس تھا اے شوقؔ وہ جاتا رہا دل سے
ستم ایجاد سے اب شکوۂ بیداد رہنے دے

۱۹۲۴ء

ساقی کے ایک جام سے سرشار ہوگئے
کیا بیخودی میں دیکھا جو ہشیار ہوگئے

کچھ ایسی داستان بھی دُکھ کی بھری ہوئی
سُن سُن کے کتنے ہی مرے غمخوار ہو گئے

لیکر چلے ہیں حسرتِ سیرِ چمن کو ساتھ
اُڑتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

طے کس طرح ہو خامیٔ اُلفت میں راہِ عشق
آسان مرحلے بھی تو دشوار ہو گئے

اک چارہ گر کو لائے ہیں سودائیانِ عشق
اچھّے بس اے جنوں ترے بیمار ہو گئے

اب کیا بتائیں کیا ہوئے سب پارہ ہائے دل
وہ بھی تو نذرِ دیدۂ خونبار ہو گئے

ضبطِ نہاں سے نالے بھی تنگ آ گئے تھے شوقؔ
آخر وہ رُکے لب اظہار ہو گئے

۱۹۲۴ء

سوزِ فرقت کو ہیں رو کے مٹانے والے
ہم لگی دل کی ہیں اشکوں سے بجھانے والے

خوں شدہ دل کو جلاتے ہیں جلانے والے
آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

ہیں ہمیں پیرِ مغاں ساقیِ مخمور بھی ہم
ہمیں پینا ہمیں پیمانہ بنانے والے

واہ رے سوزِ نہاں اُف رے یہ سوزشِ دل کی
اور کیا چاہیئے او جی کے جلانے والے

سرمۂ چشم بنے گا مرا اُٹھ اُٹھ کے غبار
دیکھنا او مری ہستی کے مٹانے والے

حق کے بندوں پہ یہ بیداد و جفا ای توبہ
بیکسوں کو نہ ستا دیکھ ستانے والے

کچھ دمِ ذبح دعاؤں کی ہے حسرت باقی
دم تو لینے دے ارے خون بہانے والے

حیف ہستی بھی تو ہو جاتی ہے اک جی کا وبال
ہوش کھو دیتے ہیں دیوانہ بنانے والے

شوق کیا رازِ حقیقت ہو کسی پر ظاہر
ہونٹ سی دیتے ہیں دیوانہ بنانے والے

سنہ ۱۹۲۴ء

سوزشِ دل پہ کبھی رحم نہ کھائے کوئی — آگ لگ جائے جگر میں نہ بجھائے کوئی
بھولتی ہائے نہیں لذتِ دردِ پنہاں — پھر تمنا ہے یہی دل کو دکھائے کوئی
دیکھکر مستِ مئے خوابِ اجل کہتی ہیں — نیند کے ماتے کو کیا خاک جگائے کوئی
میری ہستی کی بھی دنیا میں کوئی ہے بنیاد — نقشِ دیوار ہوں جب چاہے مٹائے کوئی
ایسے قصہ کو بھی کیا خاک سنائے بیٹھیں — چار آنسو جسے سن کر نہ بہائے کوئی
یہ بھی نیرنگِ زمانہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے — کوئی دم بھر کو ہنسائے تو رلائے کوئی

طالبِ دید نہ مشتاق نہ شیدائی ہے
شوق کے روبرو آئے کہ نہ آئے کوئی

سنہ ۱۹۲۴ء

نہ تیغ دو دم باڑھ پہ ہے آج ادھر بھی — ہاں چوٹ برابر کی چلی دل سے ادھر بھی
بیتابیِ دل دل میں ذرا اور ٹھہر بھی — شب ہو چکی ہوتی ہے کوئی دم میں سحر بھی
پہلے جہاں اک ٹیس سی رہتی تھی ہمیشہ — اٹھتا نہیں رہ رہ کے وہاں دردِ جگر بھی
ہر غنچہ میں پنہاں ہے ترے راز کا دفتر — گل بھی ہیں تری یاد میں گلشن کے شجر بھی
سب کچھ ہی نہاں اک تری انداز حیا میں — دل لیکے مکر جانا چرا لینا نظر بھی

تاراج کیا گلشنِ ہستی کو خزاں نے
برباد ہوئی جاکے کہیں بادِ سحر بھی

پشتارۂ عصیاں کو لیے شوق چلا ہے
منزل ہے کڑی چاہیے کچھ زادِ سفر بھی

سنہ ۱۹۲۴ء

گل و بلبل میں غلط کہتے ہیں یارانہ ہے
سبزۂ گل چمنِ دہر میں بیگانہ ہے

چشمِ ساقی کا عجب جلوۂ مستانہ ہے
اک نظر دیکھ لیا جس کو وہ مستانہ ہے

مست و بیخود جو ہوا پی کے شرابِ الفت
نہیں دیوانہ حقیقت میں وہ فرزانہ ہے

سوزِ الفت ہے مری شمع کو نسبت کیا ہے
عبرت آموزِ بصیرت پہ پروانہ ہے

پتے پتے کی زباں دیتی ہے درسِ وحدت
سبق آموز مرا سبزۂ بیگانہ ہے

بزمِ میخانہ تھی آباد ہمارے دم سے
اب نہ ساقی نہ وہ ساغر نہ وہ پیمانہ ہے

لذتِ ذوقِ سفر تجھ کو مبارک ہمدم
ایک وہ شوق ہے منزل سے جو بیگانہ ہے

سنہ ۱۹۲۴ء

یہ بزم و ساقی و پیرِ مغاں رہے نہ رہے
خمارِ نشۂ خوابِ گراں رہے نہ رہے

ستم رسیدوں کو بس اب نہ چھیڑ رہنے دے
یہ دور بھی ترا اے آسماں رہے نہ رہے

دمِ اخیر تو پوچھو کہ کیا گزرتی ہے
دہن میں دیکھیے گویا زباں رہے نہ رہے

چھٹا ہے قافلے والوں سے بہزادِ دیوانہ
اب اٹھ کے گرد بس کارواں رہے نہ رہے

اُٹھا کے آنکھ ذرا دیکھ خاتمہ ہو جائے
کہ دستِ ناز میں خنجر رواں ہے نہ رہے
نکالیں کھینچ کے آہوں کو حوصلہ دل کا
کسے خبر ہے کہ تابِ فغاں ہے نہ رہے
لیے تو جاتا ہوں بزمِ بتاں میں دلِ شوقؔ
وہاں بھی دیکھیئے یہ مہرباں رہے نہ رہے

سنہ ۱۹۲۴ع

کیا خاک راس آئے کسی کی دوا مجھے
آنکھیں دکھا رہی ہے وہ تیغِ قضا مجھے
کعبہ میں بتکدے میں کلیسا میں دہر میں
پھرتا ہوں ڈھونڈتا ہوں رہنما مجھے
میں آشیاں بناؤں کہاں باغِ دہر میں
کچھ ایسی بھا گئی ہے چمن کی ہوا مجھے
بیمار چشم ہوں میں نظر سے گرا ہوا
اب بیٹھنے دے چین سے او فتنہ زا مجھے
کیا ہے ٹھکانا بحرِ عدم میں غریق کا
پھر کس لیے رہے طلبِ ناخدا مجھے
جاؤں تلاشِ منزلِ گم گشتہ میں کدھر
خاموش ہے پکار کے بانگِ درا مجھے
عشقِ بتاں کو چھوڑنا اے شوقؔ خیر ہے
در پردہ آ رہی ہے کسی کی صدا مجھے

سنہ ۱۹۲۴ع

دور میں ساغر ہے معمورہ پیمانہ ہے
بزمِ رندانہ رہے ساقی میخانہ رہے
دل کے پردہ میں نہاں تصویرِ میخانہ ہے
کچھ دنوں تو بیخودی میں تیرا دیوانہ رہے
محوِ حیرت میں ہا کچھ ایسا شوقِ دید میں
کچھ نہ دیکھا گو وہ دل میں بے حجابانہ رہے

اک بلاکش کو اٹھے دنیا سے مدت ہو چکی
جانے والے کا کہاں تک یاد افسانہ رہے

آزما کر بارہا پہلو میں پھر بھی رکھ لیا
کاہش دل دور ہو گر دل بھی بیگانہ رہے

ایسی جلدی کیا ہے ہمدم نہ کھینچو تیر کو
کوئی دن پیکان و دل میں کچھ تو یارانہ رہے

حسن روز افزوں کی گرمی تک ہے شور عشق بھی
شمع کے بجھنے پہ کیا محفل میں پروانہ رہے

شمع کو ہے خاطر پرواز گر مد نظر
پردۂ فانوس میں بھی بے حجابانہ رہے

شوق اب جا کر کہاں بھٹکے تلاش یار میں
جلوۂ حق سے مرا پرنور بت خانہ رہے

١٩٢٥ء

مختلف رنگوں سے بیرنگ طبیعت نہ ہوئی
نہ گیا جوش جنوں کم کبھی وحشت نہ ہوئی

تیرے دیوانہ کو زنجیر کی حاجت نہ ہوئی
اس قدر محو تصور تھا کہ زحمت نہ ہوئی

راز افشا کیے کیا مری بیہوشی نے
پردہ دار دل مضطر کبھی غفلت نہ ہوئی

الفت دیر کے پابند رہے ہم ایسے
کعبہ جانے کی ہماری کبھی نیت نہ ہوئی

حسن اور عشق کے کیا رہے جھگڑے باہم
لاکھ چاہا کیے پر ترک محبت نہ ہوئی

سحر آگیں وہ نگاہیں دل روشن پہ پڑیں
حسن خود بیں سے کبھی آئینہ کو حیرت نہ ہوئی

عشق نے حسن کو پردہ سے نکالا آخر
ظلم ہے جو یہ کہے دیر کو زینت نہ ہوئی

جاذبہ شوق کجا۔ جلوہ گہ ناز کجا
جلوہ گر چشم میں اب تک کوئی صورت نہ ہوئی

شوقؔ بھولے سے نہوتا کبھی پابند جنوں
دیکھکر حالت دل بھی تمھیں عبرت نہوئی

سنہ ۱۹۲۵ء

دیکھے دل ہم کو جفاؤں کا پتہ ملتا ہی
سچ بتاؤ تمھیں کیا اہل جفا ملتا ہی

سوز پنہاں۔غم ہجراں تپش و بیتابی
اور کیا عشق میں ارباب وفا ملتا ہی

ہاتھ اُٹھاتے ہیں دعا کو تو اثر بھاگتا ہی
ہم سی مظلوموں کو کب فیض عطا ملتا ہی

خاک تربت بھی تو ڈھونڈی سی نہیں اب ملتی
اور دیکھیں ابھی کیا بعد فنا ملتا ہی

زخم دل زخم جگر کہتے ہیں ہنس کر مجھ سی
چھیڑ نشتر سے چلی جائے مزا ملتا ہی

تیری در سی کوئی جاتا نہیں محروم مگر
مجھ سے بے بہرہ کو داتا مری کیا ملتا ہی

شوقؔ اب کفر کی باتیں نہ زباں پہ آئیں
ایک ساغر تمھیں اوروں سی سوا ملتا ہی

سنہ ۱۹۲۵ء

پنہاں نظر آتا ہی پیدا نظر آتا ہے
ہر شے میں مجھے تیرا جلوہ نظر آتا ہی

ہی دیکھنے والوں سی کیوں تم کو حجاب آخر
آئینہ سی تو پوچھو کیا کیا نظر آتا ہی

ہیں جام و سبو خالی ہیں شیشہ و خم ٹوٹے
اے ساقی میخانہ یہ کیا نظر آتا ہی

بدنام محبت نے اوروں کو بھی دیکھا ہی
مجھ سا نہ کہیں لیکن رسوا نظر آتا ہی

ہر شی میں ترا نقشہ ہر گل میں ترا جلوہ
ان آنکھوں کے کھلتے ہی کیا کیا نظر آتا ہی

پھر داغوں میں سوزش ہی پھر درد کی ہی شدت رنگِ دلِ زخمی پھر بدلا نظر آتا ہی

نابود نمود یں ہیں اے شوق زمانے کی
جو کچھ نظر آتا ہی دھوکا نظر آتا ہے

سنہ ۱۹۲۵ء

قافلہ راہی ہوا ہم ناتواں دیکھا کئے دیدۂ حسرت سی گردِ کارواں دیکھا کئے
دَور کا تیرے تلون آسماں دیکھا کئے یہ تسلسل دہر کی نیرنگیاں دیکھا کئے
حسرتِ پرواز نے خونِ تمنا کر دیا بیٹھے بیٹھے ہم قفس میں آشیاں دیکھا کئے
یہ کسے معلوم منزل تک وہ پہونچے یا نہیں جا بجا ہم تو نشانِ رفتگاں دیکھا کئے
کھلتے کھلتے غنچہ و گل نذرِ گلچیں ہو گئے یہ تماشا عمر بھر ہم باغباں دیکھا کئے
نالۂ بلبل گلستاں میں سنا شام و سحر مدتوں تک سحرِ آہنگِ فغاں دیکھا کئے

شوق دم بھر بھی نہ دنیا میں رہے ہم چین سی
عمر بھر سامانِ عیشِ جاوداں دیکھا کئے

سنہ ۱۹۲۶ء

کب تاک میں ای گردشِ ایام نہیں ہی پہلو میں مری دل ہی کوئی جام نہیں ہی
کب باغ میں صیاد لیے دام نہیں ہی بلبل کو نشیمن میں بھی آرام نہیں ہی
ہیں مانعِ دیدار لگاوٹ کی نگاہیں نازاں ہی وہ چتون مری بدنام نہیں ہی
چھوٹا ہی چمن شوق اسیری کی بدولت صیاد ہمیں کنجِ قفس دام نہیں ہی

ٹھوکر نہ لگا دیکھ تو ای بُتِ مینوش
خونابۂ دل دُردِ تہہ جام نہیں ہی

اچھی نہ سہی حالتِ بیمارِ محبت
مانا یہ کہ خورشیدِ لبِ بام نہیں ہی

شیوہ نہیں ای شوق مرا وہم پرستی
آزاد ہوں پابندیٔ اوہام نہیں ہی

۱۹۲۷ء

یادِ گیسو میں لگا رہتا ہی یہ دھڑکا مجھی
ہو نہ جائے ای جنوں اگلا سا سودا مجھی

خوب واقف ہو گئی ہوں میں ایک ناکامِ ازل
کیا دکھاتی ہو مری قسمت کا لکھا مجھی

وحشتِ دل کچھ دنوں تو ساتھ دینا تھا مرا
وادیٔ غربت میں لا کر تو نے کیوں چھوڑا مجھی

تھک کے آ بیٹھا ہوں پھر میں بتکدے میں اے بتو
کاش اک جلوہ خدائی کا نظر آتا مجھی

میں ہوں سرمستِ ازل خمخانۂ جاوید کا
چاہئے ساقی نہ جام و بادہ و مینا مجھی

دل ہی خود سر میں ہوں سودائی تو پھر کیونکر نبھے
پردہ دارِ دل ہوں میں اور دل سی ہی پردا مجھی

دل کا ماتم بیٹھ کر ہوتا تو کیونکر اور کہاں
اُس کو میں نے کھو دیا خود اُس نے کھویا مجھی

غرقِ بحرِ الم کا خاک بیڑا پار ہو
نامرادی دور ساحل سی کہاں پھینکا مجھی

دیکھئے کب تک رہیں ای شوق یہ سرمستیاں
ہوش میں آنے نہ دیں گے ساغر و مینا مجھی

۱۹۲۷ء

دونوں عالم کو بھلایا تیری دیوانوں نے
ایسا وارفتہ کیا اُن کو پریخانوں نے

اشک بہتے رہے خاموش جلا کی شب بھر
کہدیا شمع سے گیا بزم میں پروانوں نے

جیتے جی ہم تو نہ تھے دیر سے اُٹھنے والے
ہم کو دھوکا یہ دیا عشق کے بیگانوں نے

جب گئے دیر میں ہر سو ترا جلوہ دیکھا
شان رکھ لی بُت کافر تری بتخانوں نے

جذبۂ عشق کے اظہار کا تھا ہوش کسے
راز کو راز ہی رکھا تری دیوانوں نے

لبِ سوفار بھی رہ رہ کے مزے لیتے ہیں
خون دل خوب پیا ہے تری پیکانوں نے

ہجر ساقی میں شرر ریز ہوئے ساغر چشم
آگ پانی میں لگائی انہیں پیمانوں نے

جب کہیں دیر و حرم میں بھی ٹھکانا نہ رہا
دی جگہ وحشیوں کو آپکے ویرانوں نے

شوق بیخود سے رہا کرتی ہو باعث کیا ہے
رازِ مستی کوئی رکیا کہدیا پیمانوں نے

۱۹۲۸ء

کبھوں کس سے ترے ارماں کی خواہش کیوں نہیں ہوتی
وہ اُلجھن کیوں نہیں ہوتی وہ کاوش کیوں نہیں ہوتی

نکلجاتی ہیں ترچھی ٹیڑھی بچکر کیوں مرے دل سے
نگاہِ ناز سے تیروں کی سازش کیوں نہیں ہوتی

ہوا کیا ہاتھ جو رکھتی نہیں وہ میرے سینہ پر
بتا اے دردِ دل اب آزمائش کیوں نہیں ہوتی

یہی کچھ کام آجائیگی دنیا سے محبت کے
ہماری سرگزشتِ دل نگارش کیوں نہیں ہوتی

کوئی حد ہے کہاں تک اپنی کشتِ آرزو سوکھے
مدد اے دیدۂ پر آب بارش کیوں نہیں ہوتی

حریصِ لذتِ غم کے لیے ترکِ جفا کیسا
دعا نا آشنا پہلی نوازش کیوں نہیں ہوتی

رہین منت دورِ فلک ہو شوق بیہ کیا ہے
دلِ ناکام تو ہی اس پہ نازش کیوں نہیں آتی

سنہ ۱۹۲۸ء

تجھے اے کاش ساقی لغزشِ مستانہ مل جائے
مقدر سے ہمیں پھر گردشِ پیمانہ مل جائے

جبیں سائی وہیں کریں وہیں کے ہم تو ہو جائیں
کہیں ہم کو جو شانِ جلوۂ بتخانہ مل جائے

جلا کر شمع سوزاں نشاں باقی نہیں رکھا
چلو ڈھونڈیں کہیں شاید پر پروانہ مل جائے

سنا کرتے ہیں اب وہ کشتگانِ عشق کے قصے
مزا ہے گر کسی سے کچھ مرا افسانہ مل جائے

دیارِ عشق ہی مشہور ہم ہیں خیر خواہوں میں
بڑی سرکار ہے ہم کو بھی اک پروانہ مل جائے

نہ خوفِ باغباں ہو اور نہ ہو صیاد کا کھٹکا
اگر تھوڑی سی جا ہم کو بس کاشانہ مل جائے

بنائیں شوق ہم بھی اپنا اک کعبہ جدا سب سے
کسی ڈھب سے اگر خاکِ درِ جانانہ مل جائے

سنہ ۱۹۲۹ء

مجو حیرت ہے ابھی سے ارے دیکھا کیا ہے
کس تصور میں ہے اے دل تمہ انقشا کیا ہے

تم وہی کرتے جو تھا دل میں تمہارے پھر بھی
پوچھ تو لیتے کبھی تیری تمنا کیا ہے

وقت آنے دے تو خود ساتھ ترے ہو لیں گے
اے اجل تیرا ابھی سے یہ تقاضا کیا ہے

مرنے والوں کو تڑپنے سے بھلا کیا حاصل
دم نکل جائیگا دم بھر میں یہ ہونا کیا ہے

دل کی بیتابی کو کچھ خاک نہ سمجھا ظالم
پوچھتا ہے وہ ہمیں سے یہ تماشا کیا ہے

پا بہ زنجیر کو ہو بادہ پیمائی کا جوش — خیر ہے حضرتِ دل آپ کو سودا کیا ہے
ہر بشر آتے ہی ہوتا ہے اسیرِ نیرنگ — باغِ عالم میں نہ جانے کہ یہ ہوتا کیا ہے
دستِ گلچیں سے بچا پایا نہ بچا گلشن میں — ورنہ ہستی بھی تری اے گلِ رعنا کیا ہے

پھر وہی سیرِ چمن پھر وہی سودائے جنوں
شوق کچھ تو کہو یہ دل میں سمایا کیا ہے

سنہ ۱۹۲۹ء

کیا دکھایا ہے سماں جلوۂ یکتائی نے — لے لیا دیکھ سنبھالا تری شیدائی نے
دیکھتے دیکھتے نیرنگ دو عالم کی فضا — کھو دیا اپنا بھرم چشمِ تماشائی نے
درد پہلو میں اٹھا بیٹھ گیا کم نہ ہوا — حوصلہ پست کیا آہِ شکیبائی نے
منزلِ عشق کی راہیں تھیں کڑی اور کٹھن — رہنمائی مری کی دشت میں رسوائی نے
دیکھنے پائے نہ ہم جلوۂ جاناں کی جھلک — کیسا دھوکا دیا آئینہ بینائی نے
ذوقِ نظارہ میں پنہاں تھا فریبِ ہستی — کھو دیا دل کہیں منت کشِ رعنائی نے
کیا ہے نیرنگِ جہاں اور ہے کیا جوشِ جنوں — بےخبر کر دیا کیا عالمِ تنہائی نے
خود تماشا ہے تو خود محوِ تماشا بھی ہے — رنگ بدلا ہے نرالا تری سودائی نے

جادۂ جلوہ گہہِ ناز نہ پایا اے شوق
لاکھ ڈھونڈا اسے گو چشمِ تماشائی نے

۱۹۲۹ء

کھینچ لائی حُسن تیری جلوہ آرائی مجھے
رہنے دی اب بیخودی میں شانِ یکتائی مجھے

اِک سماں نیرنگیوں کا ہی نظر کے سامنے
کاش اب دھوکا نہ دیتی چشمِ بینائی مجھے

شیشۂ و صہبا و ساغر لا کے رکھ دی سامنے
ساقیا بینا خبر آئے نہ انگڑائی مجھے

کیا عدم والوں کو بھی گلزارِ ہستی کی خبر
کھینچکر لائی کہاں سے تیری رعنائی مجھے

کیا کروں مجبور ہوں عشقِ بتاں چھٹتا نہیں
درسِ عبرت دی رہا ہی شوقِ رسوائی مجھے

امتیازِ وحدت و کثرت دو عالم میں کہاں
کچھ اشارہ کر رہی ہی اُس کی یکتائی مجھے

چھوڑ کر تجھکو کہاں جائے بھلا حرماں نصیب
اب تو رہنے دی یہیں اے ذوقِ تنہائی مجھے

جوشِ وحشت عشق کا مرہونِ منت کیوں نہوں
اک زمانہ نے سمجھ رکھا ہے سودائی مجھے

جُھک ہی جاتا ہوں بتانِ دیر کے سجدے کو شوق
محو کر دیتی ہی اُن کی شانِ زیبائی مجھے

۱۹۳۱ء

سینہ میں دل ہی عشق کی دنیا لیے ہوئے
پھرتا ہی اک ہجوم تمنا لئے ہوئے

گزری تمام عمر وہ اُلجھن ہی رات دن
کب سی ہوں سر میں عشق کا سودا لئے ہوئے

دل رہ نوردِ جادۂ الفت ہی اے جنوں
پھرتا ہی آبلوں کا سہارا لیے ہوئے

دستِ جنوں نے سر پہ اُٹھائی ہی کیا زمیں
ہر نقشِ پا ہی منزلِ صحرا لیئے ہوئے

دیکھا ہی ہم نے دیکھنے والوں کی آنکھ سے
ہر شوقِ دید ذوقِ تمنا لیئے ہوئے

گزری ہی ایک عمر درِ سنگِ یار پر
کب سے پڑا ہوں نقشِ کفِ پا لیئے ہوئے

کیا وادیِ جنوں کی ہیں طولانیاں کہوں
ہر ذرّہ ذرّہ وسعتِ صحرا لیئے ہوئے

بے پر کی بادہ نوشوں میں اڑتی ہی ساقیا
کیا کہہ رہے ہیں ساغرِ صہبا لیے ہوئے

حاصل فنا میں بھی ہی بقا شوقؔ کیا کہوں
ہر ذرّہ ذرّہ وُسعتِ صحرا لیئے ہوئے

۱۹۳۲ء

دلِ ایذا طلب تیری نئی دُنیا میں حالت ہے
تڑپنے میں سکوں ہی تجھکو بیتابی میں راحت ہے

نمایاں ذرّہ ذرّہ میں وہی نورِ حقیقت ہے
اُٹھا دو پردۂ غفلت تو ہر کثرت میں وحدت ہے

دلِ پرخوں کو ملتے خاک میں دیکھا نہیں جاتا
وہ بیگانہ سہی پر کیا کریں اُس کی محبت ہے

انھیں دو چار غمخواروں کے ہم مرہونِ منت ہیں
ہجومِ دردِ ناکامی ہی جوشِ یاس حسرت ہے

جسے چشمِ بصیرت ہو نگاہِ غور سے دیکھے
تماشا گاہِ عالم بھی عجب نیرنگِ حیرت ہے

کبھی اُف بھی نہ کی گھٹ گھٹ کے آخر جان تک دیدی
اور اس پہ بھی بُرا کہتے ہو مجھ کو کیا قیامت ہے

کبھی جوشِ جنوں میں ہاتھ داماں تک پہنچتا تھا
مگر اے شوقؔ دیکھو اب گریباں گیر وحشت ہے

۱۹۳۲ء

علاجِ دردِ جگر چارہ ساز رہنے دے
مزا اسی میں ہی سوز و گداز رہنے دے

فریبِ ناز بقدرِ نیاز رہنے دے
جنون و عشق میں کچھ امتیاز رہنے دے

چھپائے رازِ محبت کوئی ہزار مگر — نگاہِ شوق بھی کمبخت راز رہنے دے
وہ دورِ بادۂ رنگیں وہ دلفریب نظر — خدا ہی ہے جو مجھے پاکباز رہنے دے
حریفِ حُسنِ حقیقت نہیں نظر کوئی — پڑے حجاب نقابِ مجاز رہنے دے
سوال کی کبھی عادت نہیں مگر پھر بھی — مرے لیے بھی کچھ عاجز نواز رہنے دے
نہ پوچھ دل نے خطا کی کہ تیری یاد کی نے — جو کچھ ہوا سو ہوا دلنواز رہنے دے
حریمِ ناز میں ظاہر ہے بے زبانیِ شمع — اُسی کو محرمِ راز و نیاز رہنے دے

وہ زود رنج ہے اور وقت مختصر اے شوق
شکایتِ گلہ ہائے دراز رہنے دے

سنہ ۱۹۳۲ء

فکرِ خرد و ہوش سے بیگانہ بنا دے — اے جلوۂ رسوا مجھے دیوانہ بنا دے
اے حُسنِ ازل اپنی اداؤں کا تصدق — اندیشۂ کونین سے بیگانہ بنا دے
پابوسیِ جاناں کی تمنا تو نہ رہ جائے — کچھ ہو مجھے خاکِ درِ جانانہ بنا دے
بے کیف نہ رہ جائے کہیں قصۂ الفت — روداد دلِ زار کو افسانہ بنا دے
آیا ہوں میں اب بارگہِ نازِ حسن — سر خم ہے اُسے سجدۂ شکرانہ بنا دے
رہ جائے بھٹکنے سے نہ ساقی کوئی میکش — ہر دور کو تو گردشِ مستانہ بنا دے

جل بجھ کے کہیں خاتمۂ دل بھی ہوا اے شوق
اُس کو تو کسی شمع کا پروانہ بنا دے

۱۹۳۲ء

کیا کرے چھیڑ کے افسانۂ ہجراں کوئی
نہیں سنتا نہیں سنتا کسی عنواں کوئی

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معمّہ کیا ہے
پردۂ ساز میں رہتا ہے جو پنہاں کوئی

بس بس اے دستِ جنوں حد سے نہ بڑھنا ہرگز
ہے نہ دامن کوئی باقی نہ گریباں کوئی

پردہ داری مجھے ڈر ہے نہ زباں بن جائے
تا بکے دل میں رکھے درد کو پنہاں کوئی

کرتی ہے ہم شکوۂ بیداد تغافل لیکن
خود ہوا جاتا ہے ناکردہ پشیماں کوئی

رونق بزمِ حسیناں ہے ہمارے دم تک
تجھ کو پوچھے گا نہ پھر شمع شبستاں کوئی

اس قدر محو کیا ذوق خود آرائی نے
دیکھکر اپنی اداؤں کو ہے حیراں کوئی

دیکھنے والے کی آنکھوں سے کہیں چھپتا ہے
ہو نہیں سکتا ہے پردے میں بھی پنہاں کوئی

آج رہ رہ کے کھٹک ہوتی ہے دل میں اے شوق
رہ گیا ٹوٹ کے کیا تیر کا پیکاں کوئی

۱۹۳۱ء

مری نازو نیازِ عشق میں اک رازِ پنہاں ہے
عیاں ہے حسن گو پردے میں پردہ نمایاں ہے

خوشا قسمت حریم ناز کا وہ اٹھ گیا پردہ
نگاہِ شوق سے مت پوچھ وہ دیکھا جو حیراں ہے

نئی روداد ہے دل کی نرالا جس کا عنواں ہے
بتائیں کیا عجب مضمونِ اوراقِ پریشاں ہے

جنونِ حوصلہ فرسا کا میں مرہونِ منت ہوں
کہاں کی ساز و سامانی گریباں ہے نہ داماں ہے

نہ وہ خونابہ افشانی نہ وہ اب جوشِ گریہ ہے
مری اتری ہوئی تصویر سے آئینہ حیراں ہے

مزہ دیتی تھی کیا کیا بیخودی دل کی تپانی
جب آیا ہوش اُس کا کوئی خواہاں ہے نہ پرساں ہے

ہمارا قصۂ غم بر زبانِ بے زبانی ہے
زبانِ شمع کیا کہتی وہ خود ہی سوختہ جاں ہے

جہاں تک دھجیاں ملجائیں بکھری میری دامن کی
سمجھ لینا وہیں تک وسعتِ حدِ بیاباں ہے

صدا ہائے انا الحق بیخودی میں سن کے چونک اُٹھے
کھلی آنکھیں تو دیکھا شوق بازیٔ گاہ طفلاں ہے

زمیں کا چپہ چپہ چھان ڈالا شوقِ وحشت میں
مگر دیکھا کہ ہر جا گردشِ گردونِ گرداں ہے

۱۹۳۶ء

نظر کو گلشنِ عالم میں اک حیرت سی حیرت ہے
تماشائے جہاں آئینۂ چشمِ بصیرت ہے

نہ شوقِ بندگی میں سجدۂ پیہم سے فرصت ہے
سراپا بیخودی میں دل پرستارِ محبت ہے

مقابل ہیں وہ رکھکر آئینہ خاموش بیٹھے ہیں
مگر حیرت بتاتی ہے کہ تیری ہی یہ صورت ہے

نہ ساقی ہے نہ میکش ہے نہ ساغر ہے نہ خم خانہ
یہ حیرت خیز بزمِ دہر میں نیرنگِ فطرت ہے

تصوّر میں نہ کوئی صورتِ زیبا نظر آئی
مگر جب بتکدے پہنچے تو دیکھا ایک مورت ہے

مری بیتابیاں ہیں نغمہ سنجِ غبطِ وحشت میں
وہ آہنگِ جنوں ایک ہے وہ سازِ حقیقت ہے

وہ اک ہم ہیں کہ جو افتاد پڑتی ہے اُٹھاتے ہیں
خموشی کا یہ عالم ہے نہ کچھ تم سے شکایت ہے

دلِ صبر آزما اور اُس سے صبر آزما شکیبائی
کوئی شنوا نہیں اُس کا قیامت ہی قیامت ہے

عجب حیرت فزا ہے عالمِ شہرِ خموشاں بھی
نہ آنا اس طرف اور آنیوالی جائے عبرت ہے

نظر آتا ہے کس کی حسن کا ہر ذرہ میں جلوہ
مرقع ہیں دو عالم کے تمھاری ایک صورت ہے

دلِ مہجور سنتا ہی نہیں افسوس کیا کہیے
کوئی اتنا نہیں اے شوق پوچھے کیسی حالت ہے

سنہ ۱۹۳۲ء

جس کو ہم سمجھے تھے مشکل سعیِ لاحاصل نہ تھی
جستجوئے یار گر کرتے تو کچھ مشکل نہ تھی

جادۂ دشتِ جنوں میں کیوں بھٹک کر رہ گئے
کیا طریقِ عشق میں باقی کوئی منزل نہ تھی

میکدے میں حال روشن تھا ہر اک مے نوش کا
چشمِ ساقی گو رہی مخمور پر غافل نہ تھی

اوچھے اوچھے وار کرنا نیم بسمل چھوڑنا
کس سے سیکھا ہے - یہ عادت تیری اے قاتل نہ تھی

رہ گئے کیوں رہروانِ عشق راہِ شوق میں
وائے ناکامی کچھ ایسی سخت یہ منزل نہ تھی

درد و غم کا کچھ گلا تھا اور کچھ شکوہ بھی تھا
آپ کے سننے کے قابل داستانِ دل نہ تھی

عبرت آموزِ فنا تھی ہستیِ جامِ حباب
عافیت کا ذکر کیا وہ بھی لبِ ساحل نہ تھی

ہاتھ کیوں کانوں پہ تم نے رکھ لیے منہ پھیر کر
کیا بیان کرنے کے قابل داستانِ دل نہ تھی

بارہا پیدا ہوئے سامانِ وجہِ معصیت
شوق کیا کرتے طبیعت ہی ادھر مائل نہ تھی

سنہ ۱۹۳۱ء

ہزار نالے کیے ہیں ہم نے مگر انھیں کچھ خبر نہیں ہے
رہی کیسا یہ سوزِ دل ہے کہ جس میں مطلق اثر نہیں ہے

ستم کے پردہ میں بھی کرم ہے گئے ہیں در پردہ لطف و احسان
نگہ کرشمے دکھا رہی ہے مگر ہماری نظر نہیں ہے

جنوں میں جا دوسی ہے یہ باہر تباہ سمجھائیں دل کو کیونکر
وہاں اُسی جائیں لیکن کیونکر جہاں ہوا کا گزر نہیں ہے

لبوں پہ اُف تک آنے پائی ہی تو ہی دادِ جلووں کی
فلک ٹوٹا ہو جس کے سر پر کوئی بھی ایسا بشر نہیں ہے

ہمیں ہے شوقِ وفا پرستی انھیں ہے حسنِ حسین کی مستی
مآل پر عشق کے نظر کچھ ادھر نہیں ہے ادھر نہیں ہے

وہ کیوں نہ ہوں جور و ستم پہ عادی ہے جوشِ وحشت سے دم ہرا
کہاں وہ جاتا ہے ہمکو لیکر ہمیں کچھ اس کی خبر نہیں ہے

غضب کیا ہے یہ باغباں نے وہ شاخیں کاٹی ہیں جو گھنی تھیں
ذرا تو دم لیتے جس کے نیچے کوئی اب ایسا شجر نہیں ہے

اُدھر خزاں کی ہے آمد آمد اِدھر ہے صیاد بد مروت
کہاں نکالیں اب آشیاں صفیر و چمن میں اپنا گزر نہیں ہے

اُنھیں کے مارے ہوئے وہ ہیں ہزاروں پامال ہو رہے ہیں
اِدھر کی دُنیا اُدھر ہوئی ہے مگر اُنھیں کچھ خبر نہیں ہے

درخت جتنے ہیں فصلِ گل میں پھل انہیں لوگوں کو دے رہے ہیں
مگر وہ اک نخلِ آرزو ہے کہ جس میں آتا ثمر نہیں ہے

اُدھر وہ نازک مزاج ٹھہرے اِدھر یہ ضبطِ فغاں کا عادی
خموش ہوں اُن کے آگے ایسا کہ جیسے دردِ جگر نہیں ہے

وہاں نمونہ ہے ہجر کی یہاں لبوں سے لگا ہے ساغر
جہاں یہ ہے ہم وہیں جلوہ فرما وہاں ہماری گزر نہیں ہے

خبر بھی ہے شوقؔ تم کو اپنی کٹے گا کیسے عدم کا رستہ
سفر بھی ایسا سفر کہ توبہ اور اُس پہ زادِ سفر نہیں ہے

۱۹۳۲ء

آساں ہے مرگ و زیست وفادار کے لیئے
مشکل ہر ایک سہل ہے دشوار کے لیئے

کچھ دن ٹھہر کے دیکھ تو بزمِ خیال میں
جلوے عیاں ہیں طالبِ دیدار کے لیئے

سوزِ دروں سے دل کا لہو خاک ہو گیا
اب خوں کہاں ہے دیدۂ خونبار کے لیئے

وہ اک کھٹک جو ہوتی ہے رہ رہ کے قلب میں
کچھ کم نہیں ہے لذتِ آزار کے لیئے

جب آہِ ناتواں بھی نہ لب تک پہنچ سکی
نالے نے دم دیا دلِ بیمار کے لیئے

اُف کس قدر ہیں حسرتِ ارمان آرزو — سینے میں جا نہیں ترے سوفار کے لیے

بنتِ عنب کی تاک میں رہتے ہیں شوق بھی
جاتے ہیں سیر خانہ خمار کے لئے

۱۹۳۲ء

پلٹ آتی ہے ٹکرا کر صدا ہر در سے سائل کی — الٰہی شرم تیرے ہاتھ ہے ٹوٹے ہوئے دل کی
قیامت کا تھا نظارہ ہجوم سر فروشاں ہے — ہوئیں خم گردنیں جس دم اُٹھی شمشیر قاتل کی
یہ پاس ضبط ہے زنداں میں تھی تیرے اسیروں کو — کہ اب آواز تک آتی نہیں شورِ سلاسل کی
کہاں تک یہ حجابِ ناروا پر شوق نظروں سے — خبر شاید نہیں تم کو کسی کے جذب کامل کی
وہی ہے انجمن لیکن نہ مطرب ہے نہ نغمہ ہے — کہاں ہے وہ ترنم ریزیاں اب سازِ محفل کی
نیاز و ناز کا منظر بھی وہ تھا دید کے قابل — کشاکش موجِ دریا کی کشش آغوشِ ساحل کی
مرے آئینۂ دل میں تصور تیرا کیا آیا — کہ تصویریں مٹیں سب بجز وجودِ اوہامِ باطل کی

نکلنا بار ہے اے شوق زندانِ محبت سے
کہ الفت ہے گریباں گیر اب طوق و سلاسل کی

۱۹۳۲ء

جوش زن خونِ شہادت ہر رگِ بسمل میں ہے — پھر رکاوٹ سی رکاوٹ خنجرِ قاتل میں ہے
شوق کہتا ہے کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے — مرنے والو کچھ کہو تو کیا تمھارے دل میں ہے
گوہرِ مقصود ہے یا موجِ گردابِ فنا — یہ کسے معلوم ہے کیا دامنِ ساحل میں ہے

ہے وہ مستغنیِ دورِ بادۂ بزمِ نشاط　　ساقیا کافی ہے وہ جو کاسۂ سائل میں ہے
گو ہیں درماندہ بڑھی جاتی ہیں اس امید پر　　کچھ سہارا ہمتوں کا آخری منزل میں ہے
شمع بھی پروانہ بھی مینوش بھی مینا بھی ہے　　ساقیا پھر یہ اداسی کیوں بھری محفل میں ہے
جلوہ گاہِ حسن رنگیں آئینہ ہے قلب کا　　عشق کی تکمیل پنہاں جذبۂ کامل میں ہے
پردۂ حسنِ حقیقت ہے ہر اک نقشِ مجاز　　کس بلا کی دلفریبی پیکرِ باطل میں ہے

شوق کیوں راہ طلب میں تو ڑکر بیٹھے ہو پاؤں
کچھ مزا ناکامیوں کا دوریِ منزل میں ہے

۱۹۳۲ء

تڑپتے ہیں ادائے تیغِ قاتل دیکھنے والے　　کہاں ہیں آگے دیکھیں رقصِ بسمل دیکھنے والے
فنا کی کشمکش درسِ حیاتِ تازہ دیتی ہے　　تماشائے شکستِ موجِ ساحل دیکھنے والے
چمک ہے درد ہے زخمِ جگر ہے داغ سوزاں ہے　　تجھے کیا کیا دکھاؤں حالتِ دل دیکھنے والے
تماشا ہے فریبِ ہستیِ فانی پہ مٹنا کیا　　تجھے کیا ہو گیا ہے نقشِ باطل دیکھنے والے
تجلی کس کے جلوے کی ہے ظلمت خانۂ دل میں　　کمالِ جذب دیکھ اے جذبِ کامل دیکھنے والے
سحر ہونے سے پہلے ہی نظامِ عیش کیوں بدلا　　تجھے بھی کچھ خبر ہے رنگِ محفل دیکھنے والے
فریبِ جستجو سے شوق میں راہ طلب گم کی　　بھٹکتے پھر رہے ہیں خوابِ منزل دیکھنے والے

نہ آیا شوق کچھ بھی رحم وقتِ مشقِ پامالی
وہ ہوتے کون ہیں بیتابیِ دل دیکھنے والے

سنہ ۱۹۳۴ء

آج حُسن ناپشیماں کو پشیماں کیجیے
عشق کی رسوائیوں کو اور عریاں کیجیے

بیکسی کو بھی شریکِ دردِ ہجراں کیجیے
رات کٹنے کا شبِ غم کوئی ساماں کیجیے

تا کجا ضبطِ جنونِ شوقِ پنہاں کیجیے
اُٹھیے اور سیرِ فضائے دشتِ امکاں کیجیے

مانعِ عرضِ تمنا احترامِ حسن ہے
رنگِ رُخ سے حسرتِ دل کی نمایاں کیجیے

حُسن کے جلووں کو رہنے دیجیے زیرِ نقاب
کس لیے برہم نظامِ بزمِ امکاں کیجیے

خود ہی زنجیرِ جنوں لیتی ہے بڑھ بڑھ کر قدم
ایسے دیوانوں کو کیا پابندِ زنداں کیجیے

باز آئے دعویٔ خوں سے شہیدانِ ستم
منفعل ہو کر نہ سرِ زیبِ گریباں کیجیے

ذرہ ہائے خاک ہیں خود ہی پریشاں زیرِ چرخ
فائدہ کیا اور کیوں اُن کو پریشاں کیجیے

کچھ سہارا اگر دلِ بےچارہ دیتا رہے
اور کچھ دن ضبطِ رنجش ہائے پنہاں کیجیے

کیا عجب ہی باعثِ تسکین ہو جائیں کبھی
دل کے یہ ٹکڑے ہیں اِن کو زیبِ داماں کیجیے

داستانِ دل ہوئی ہے شوقِ تقویمِ کہن
از سرِ نو شرح اوراقِ پریشاں کیجیے

سنہ ۱۹۳۴ء

ہو گئی درماندگی وجہ سکونِ دل مجھے
ڈھونڈتی ہے کس لیے اب کاہشِ منزل مجھے

یاد آئی پھر تری رنگینیٔ محفل مجھے
پھر کہیں رسوا نہ کر دے اضطرابِ دل مجھے

ہو گیا حاصل مآلِ سعیٔ لاحاصل مجھے
دور سے آیا نظر وہ جادۂ منزل مجھے

جو قدم بھٹکا وہ خضرِ جادۂ مقصود تھا — خود میری گم گشتگی لائی سرِ منزل مجھے

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہی لطفِ بیخودی — محوِ حیرت رہنے دی نیرنگیٔ محفل مجھے

وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولے ٹھنڈے ہوئے — کیا ملا تجھکو ملا کر خاک میں اے دل مجھے

راندۂ دیر و حرم ہوں میکدہ اپنا نہیں — کر دیا کیا خانماں برباد تو نے دل مجھے

لطفِ ہم آغوشیٔ امواج بھی کچھ کم نہ تھا — بیبسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے

مست رہتا ہوں میں خود اپنی نوائے شوق سے — چھیڑتی ہے کیوں صدائے نغمۂ محفل مجھے

جلوۂ لیلےٰ کہاں یہ دیدۂ حیراں کہاں
شوق دھوکا دے رہا ہے پردۂ محفل مجھے

سنہ ۱۹۳۵ء

آتشِ تر ساقیا کیا تیرے میخانہ میں ہے — سوزِ صہبائے محبت دل کے پیمانے میں ہے

ڈھونڈتی ہیں دل میں وہ سوزش گر ملتی نہیں! — سوزِ پنہاں اے جنوں جو شمع و پروانے میں ہے

لاکھ میں پہچان لیگا تجھکو کہہ کر پُر جفا — ہاں ابھی یہ ہوشیاری تیرے دیوانے میں ہے

اضطرابِ پُر سکوں، بیتابیٔ دردِ دروں — دیکھئے کیا ساز و ساماں میرے کاشانے میں ہے

سرد آہیں کھینچ کر تسکینِ دل ہوتی نہیں — سوزشِ دل کا مزا تو آگ لگ جانے میں ہے

گو نہیں باقی جنوں میں امتیازِ حسن و عشق — ایک وحشت پھر بھی اب تک تیرے دیوانے میں ہے

لے گئی جانے کہاں یہ بیخودیٔ ذوقِ عشق — زندگی کا لطف حاصل دل کے آ جانے میں ہے

بُت پرستو رازِ حسنِ مجازی ہی نہیں — اضطرابِ دل۔ سکونِ قلب بتخانے میں ہے

شوقؔ ایسی بیخودی کیا کچھ خبر تجھ کو نہیں
بادۂ پرکیف تو خود تیرے پیمانے میں ہے

۱۹۳۲ء

آتشِ عشق بلا آگ لگائے نہ بنے
اور ہم اُس کو بجھائیں تو بجھائے نہ بنے

رنگِ رخ اڑنے پہ آجائے تو روکے نہ رکے
لاکھ وہ راز چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

کیا مزہ ہو نہ رہے یاد جو اندازِ جفا
میں کہوں بھی کہ بتاؤ تو بتائے نہ بنے

خود وفا ہے مری شاہد کہ وفادار ہوں میں
لاکھ تم دل سے بھلاؤ تو بھلائے نہ بنے

دل کے ہر ذرہ میں ہے سوزِ محبت کی نمود
خاک میں اُن کو ملاؤں تو ملائے نہ بنے

راہِ الفت نے کچھ ایسی مری صورت بدلی
دامنِ دشت چھپائے تو چھپائے نہ بنے

دل کو اب تابِ تلافی و مداوا بھی نہیں
چارہ گر آئے تو احسان اٹھائے نہ بنے

کوئی خاکہ مری تصویر کا کھینچے تو سہی
کھنچ بھی جائے کوئی نقشہ تو مٹائے نہ بنے

موت قابو کی نہیں اور نہ ٹھکانا اس
کونسا وقت اُس پہ بھی آئے کہ بن آئے نہ بنے

ایسے ڈھب سے ہو گئے اُن کے ستم کا ای شوقؔ
بات کچھ چاہیں بنانی تو بنائے نہ بنے

۱۹۳۲ء

دردِ فرقت کی کہانی اور ہے
بلبلوں کی نغمہ خوانی اور ہے

کشتگانِ عشق کا مرنا ہے اور
مرمٹوں کی زندگانی اور ہے

لب نہ کھلنے پر بھی کہدیتی ہیں ہم
بیخودوں کی بےزبانی اور ہے

چارہ سازو کیا ہو تدبیرِ علاج
دل میں اک دردِ نہانی اور ہے

مرہی جاتا ہی نہیں سودائے عشق
مفت کی یہ سرگرانی اور ہے

باتوں باتوں میں اڑا لیتے ہیں شوق
اُن کی طرزِ دلستانی اور ہے

نقشِ ہستی مٹ گیا۔ لیکن ابھی
اس زمیں پر اک نشانی اور ہے

کچھ ابھی سے آپ تو اُکتا گئے
سُنئے سُنیئے اِک کہانی اور ہے

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اس کو شوق
بیدلوں کی بے زبانی اور ہے

۱۹۳۲ء

ساقی کی صرف چشمِ مراعات چاہیئے
ہم کو نہ پھر کسی کی مدارات چاہیئے

دیر و حرم کی یاد دلانے سے فائدہ
مستِ الست کو تو خرابات چاہیئے

کب تک ستم رسیدوں پہ یہ جورِ ناروا
آخر تو کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

تنگ آ گیا ہے اُن کے تغافل سے اب تو دل
کچھ حیلہ بہرِ ترکِ ملاقات چاہیئے

بیداد کچھ ہوئی ہے تو نادم ہیں آپ کیوں
کہتا ہے کون اُس کی مکافات چاہیئے

پیمانے والو وقتِ صبوحی بھی آ گیا
کچھ دیر اب تو ذکرِ مناجات چاہیئے

سہنی ہیں کچھ مصیبتیں آغازِ عشق میں
ہاں رفتہ رفتہ مشقِ مساوات چاہیئے

جب دل سے پوچھتا ہوں تو ہے خامشی جواب
اب کیا بتاؤں کیا مجھے دن رات چاہیئے

عصیاں کا بار لے کے چلے ہو کدھر کو شوق
توشہ کچھ اور بہرِ مکافات چاہیئے

۱۹۳۳ء

وہ ہو علاجِ درد مداوا کہیں جسے
ایسا تو ہو کوئی کہ مسیحا کہیں جسے

پرسانِ حال کوئی نہیں جس کا نام لیں
اک دردِ دل ہی ہے کہ شناسا کہیں جسے

مشکل یہ ہے کہ آپ تو سنتے ہی کچھ نہیں
رودادِ عشق وہ کہ فسانہ کہیں جسے

جلوہ یہی دیکھیئے کہیں آنکھیں جھپک جائیں
یوں چشم وا ہو ذوقِ تماشا کہیں جسے

اللہ ایسی دے مجھے توفیقِ رہِ جنوں
سر میں وہ دُھن سمائے کہ سودا کہیں جسے

سب حسرتوں کو خاک میں ظالم ملا دیا
اب دل میں کیا رہا کہ تمنا کہیں جسے

یہ بارِ زندگی کہیں ہلکا نہ شوق ہو
اتنا تو ہو کہ حاصلِ دنیا کہیں جسے

۱۹۳۴ء

حسن کہتا ہے مجھے کچھ اور عریاں دیکھیے
پھر تماشائے نگاہِ چشمِ حیراں دیکھیے

وارداتِ قلب کا قصہ ہے کوئی دم میں ختم
خاک میں ملتی ہیں اک مدت کے ارماں دیکھیے

توبہ کرنے کو تو کر لی پر نہیں نیت بخیر
لیکے جائے کس طرف انبارِ عصیاں دیکھیے

بیخودیٔ شوق ہی اک پردہ دارِ بزمِ ناز
چشمِ ظاہر بیں کو کتنے دن ہی حیراں دیکھیے

کھول دیتی ہے نگاہِ شوق پردہ عشق کا
چھپ سکیگا کس طرح یہ رازِ پنہاں دیکھیے

دل یہ کہتا ہے کہ ہمت پا شکستہ ہو چکی
جوشِ وحشت کی ہے یہ ضد حدِ امکاں دیکھیے

نغمۂ غم تارِ شکستہ نوائے دل گداز
یہ ملا ہستی سے ہم کو ساز و ساماں دیکھیے

چھیڑ دیجیے نوکِ مژگاں سے رگِ جانِ حزیں
کم نہ ہو جائے کہیں یہ دردِ پنہاں دیکھیے

دید کے قابل تماشائے جنونِ شوق ہے
چاکِ داماں دیکھیے چاکِ گریباں دیکھیے

۱۹۳۵ء

کہانی کیا سنائیں داغ ہائے سوزِ ہجراں کی
جو تجھ سے ہو سکے دیکھ آ کے حالت دیدۂ پنہاں کی

کسی کی جستجو میں ہیں نگاہیں چشمِ حیراں کی
نظر آتی نہیں وہ دلفریبی بزمِ امکاں کی

گلا کس شوق سے ملتی ہے جانبازوں سے رہ رہ کر
خدا جانے حیا کیا ہو گئی وہ تیغِ عریاں کی

نہ وہ جوشِ جنوں باقی نہ وہ سامانِ وحشت ہے
خبر بھی کون لے اب جیب و داماں و گریباں کی

ہمیں تقدیر سے ایسا دلِ ناکام ہاتھ آیا
کہ مسکن جس میں حسرت کا ہے منزل ہے حرماں کی

ستم کی ماری سوئی ہیں اسی بستی میں آ آ کر
اری برباد مٹی تو نہ کر گورِ غریباں کی

اسیرانِ کہن کی یاد اب تک دل میں باقی ہے
کہ آتی ہیں صدائیں نالۂ زنجیرِ زنداں کی

بجھے کس وقت میں افسوس یہ داغِ دلِ سوزاں
نہ کرنے پائے کچھ بھی سیر ہم بزمِ چراغاں کی

ہمیں اے شوق ایسا خاکساری میں مزا رہتا
ہوا کو بھی اٹھانے دی نہ گرد اسی بیاباں کی

سنہ ۱۹۳۵ء

کوثر کی کہاں سے رند پاتے — بھٹی کی کھنچی شراب پی لی
ساقی کی نظر بچا کے ہم نے — جو کچھ تھی بچی شراب پی لی
سرجوش نہ تھی ملی جو ہم کو — کہنے کو تو ہاں شراب پی لی
ساقی کی سُنی نہ ایک ہم نے — ہاں ہاں چھلک کر شراب پی لی
دورِ ساغر جب آیا ہم تک — ساقی نے جو دی شراب پی لی
کچھ ایسی مزے کی تھی کہ توبہ — چپکے چپکے شراب پی لی
ساقی نے اڑائے دام جو تھے — یاروں نے بھی بےحساب پی لی
خودسر کس نے تجھے بنایا — کیسی خانہ خراب پی لی
بدمستیٔ شوق دیکھیے گا
پانی کے عوض شراب پی لی

سنہ ۱۹۳۵ء

پائی نہ ہوا بھی رنگ و بو کی — دل نے کیا خاک جستجو کی
وہ دل اے کاش ہم کو ملتا — ہوتی جسے دھن نہ آرزو کی
وحشت نے وہ دھجیاں اڑائیں — دامن میں جگہ نہیں رفو کی
آتے ہی بہار ہنس دیے وہ — بس انہی گلوں نے گفتگو کی
ہیں مست الست رند ساقی — ساغر کی خبر نہ کچھ سبو کی

دل کہتے ہیں جس کو سب وہ کیا ہے
اک بوند ہی سینہ میں لہو کی

خنجر نے اُسے نہ منہ لگایا
کیا بات رہی رگِ گلو کی

مٹی میں ملایا دل کو افسوس
کیا آپ نے میری آبرو کی

بیٹھے آخر کو شوق تھک کر
کچھ پیش گئی نہ جستجو کی

اپنی بیتی وہ کچھ تو کہتا
تم نے دل سے نہ گفتگو کی

بیٹھے رہے شوق کیسے خاموش
کیوں اُس سے نہ تم نے گفتگو کی

سنہ ۱۹۳۶ء

سراپا ذکرِ دردِ غم ہیں تیری ناکامیاں میری
زبانِ ہر کس و ناکس پہ ہے اب داستاں میری

بجا ہے کیا کہوں تم سے نگاہ ہی زباں میری
اُسی پر ختم ہو جائے نہ ساری داستاں میری

رولائے گی تجھے بھی خونِ یادِ آشیاں میری
نشانی کچھ تو رہنے دو چمن میں باغباں میری

کہوں کیا ایک ساغر بھی تو مانگے سے نہیں ملتا
نہیں سنتا نہیں سنتا ہے ساقی بھی فغاں میری

سہارا چاہیے اے جوشِ وحشت اور تھوڑا سا
بنی ہیں خضرِ راہ راستی ناکامیاں میری

ابھی تو کھیل سمجھے ہو مرے دل کی مٹانے کو
رلائیں گی لہو تم کو بھی بربادیاں میری

نوا سنجِ چمن ہوں ہم صفیرو تم سے کہتا ہوں
اُٹھا سکتا نہیں کوئی بھی آہنگِ فغاں میری

بھرا بیٹھا ہے دل کیا جانے کیا منہ سے نکل جائے
نہ چھیڑو اس کو رہنے دو نہ کھلواؤ زباں میری

زبانی مجھ سے کیا رودادِ غم اپنی بیاں ہوتی
اُدھر بدلے تری تیور اِدھر بدلی زباں میری

بھلا دی یاد میری شوق میرے ہمنشینوں نے
مزے کی تھیں اگر ہوتیں بیاں رسوائیاں میری

سنہ ۱۹۳۶ء

سمجھا نہیں اب تک کوئی کیا رازِ بقا ہے — آغازِ بقا جو ہے وہ انجام بقا ہے
دل میں جو کھٹک تھی وہی کچھ آج سوا ہے — اُف اُف نگہِ یاس میں کیا درد بھرا ہے
آہِ دلِ پُر درد نہ تاثیرِ دعا ہے — اب تابِ فغاں اور نہ احساسِ جفا ہے
اغیار نہ سن لیں نہ کہیں راز ہو افشا — ہر آہ شکستِ دلِ محزوں کی صدا ہے
تسکین، نہ دلاسا نہ تسلی نہ تشفی — جاتی ہوئی دنیا میں یہ کیا رسمِ وفا ہے
نیرنگیٔ عالم پہ نہ جا او دلِ ناداں — کچھ دیکھ تو آنکھوں سے عجب رنگِ فضا ہے
پھر جاتی ہیں نظروں میں وہ خاموش نگاہیں — چبھتی ہوئی سفاک کی ہر ایک ادا ہے
پیشِ نظر آ جاتی ہے اک صورتِ زیبا — جلوہ ترا آئینہ میں تصویر نما ہے

پہلو میں دلِ زار ہی رہتا نہیں جب شوق
آ جاتا ہے یہ لب پہ "ہمارا بھی خدا ہے"

سنہ ۱۹۳۶ء

تابشِ جلوۂ جاناں نہ بنے یا نہ بنے — دیکھیں ویرانہ جلوخانہ بنے یا نہ بنے
قطرۂ مے کے لئے کاسۂ دل ہی خالی — اب وہ کشکولِ فقیرانہ بنے یا نہ بنے
چھیڑ کر سن تو سہی کہتا ہے کیا سازِ جنوں — غم نہیں نغمۂ مستانہ بنے یا نہ بنے

شیشہ و ساغر و خم جام و سبو ساقی وہ
دل بھی اب دیکھیے میخانہ بنے یا نہ بنے

ہاتھ کچھ آ ہی گئے شیشۂ دل کے ٹکڑے
دیکھنا اب ہی کہ پیمانہ بنے یا نہ بنے

ہم نفس آ کہ سنائیں تجھے اپنی رودا
کیا خبر بعد کو افسانہ بنے یا نہ بنے

شوق مانا کہ تجھے ذوق جبیں سائی ہے
با ادب سجدۂ شکرانہ بنے یا نہ بنے

سنہ ۱۹۳۷ء

پہلو سے اب نکل کر ای دل چلا کہاں ہے
کیا ہوگا جستجو سے آنکھوں ہیں جو نہاں ہے

چھٹ کر چمن سے دیکھا گلشن نہ آشیاں ہے
رنگ چمن اڑا ہی چھائی ہوئی خزاں ہے

بھٹکے ہوئے مسافر رہبر ہو کون تیرا
کچھ بھی خبر ہی تجھ کو منزل تری کہاں ہے

بے چین ہو نہ ای دل کچھ صبر کر سحر تک
پھر ہم کہاں کہاں تو اک شب کی درمیاں ہے

رودا دبیکسی کو اب کیا کروگے سن کر
وہ درد سی بھری ہی نا قابل بیاں ہے

ہمت نہ ساتھ چھوڑی پای طلب ٹوٹی
گم کردہ راہ ہیں ہم ویرانہ اک جہاں ہے

اس کو جفا کا چسکا ہم بھی جفا کے طالب
ای شوق وہ ستمگر اس پر بھی بدگماں ہے

سنہ ۱۹۳۷ء

شکوہ نہ جور کا ہی نہ کچھ عرض حال ہے
پھر بھی انھیں ہماری طرف سی ملال ہے

سن لیجیے۔ غریب کا آخر سوال ہے
دشواریاں ہزار ہیں اور عرض حال ہے

دنیا ہے اور حسرتِ ناکامی مراد — دل ہے کہ بارِ زیست بھی اُس پہ وبال ہے
ہم ایسے خوگرانِ مصیبت کے واسطے — شامِ شبِ فراق بھی صبحِ وصال ہے
بھر دے شرابِ عشق سے پیاسا ہوں ساقیا — پہلو میں دل نہیں یہی جامِ سفال ہے
درماندگانِ عشق کی مایوسیاں نہ پوچھ — کچھ حاجتِ بیاں نہیں صورت سوال ہے
وحشت کا ہو بھلا کہ ٹھہرتے نہیں قدم — ورنہ جنوں میں کانٹوں پہ چلنا محال ہے
خاموش کب سے بیٹھے ہیں دیوانگانِ عشق — لیکن وہی ہے دھن وہی جوشِ خیال ہے
اے موجِ بحرِ عشق نہ مجھکو ڈبو ابھی — میں جس میں غرق ہوں وہ کسی کا خیال ہے

کیا شوقِ دلِ شکستہ سے واقف نہیں ہیں آپ
بیکس ستم رسیدہ کا آشفتہ حال ہے

۱۹۳۷ء

ہے عناصر پر قرارِ زندگی — ضبطِ بیتابی ہے بارِ زندگی
دشمنِ جاں اضطرارِ زندگی — کیجیے کیا اعتبارِ زندگی
رنگ لائی اشکِ گلگوں کی فضا — اس کو کہتے ہیں بہارِ زندگی
ٹوٹنے پائے نہ یہ تارِ نفس — بس اسی پر ہے مدارِ زندگی
ہو چکی سیرِ چمن اے ہم نفس — ہو گیا ویران دیارِ زندگی
صفحۂ ہستی سے مٹنا تھا مٹے — تھے کبھی ہم یادگارِ زندگی
ہر نفس جاتا ہے یہ کہتا ہوا — اب کیا کیجے شمارِ زندگی

مے سے خالی ہو گیا مینا و جام
کب تک آخر یہ خمارِ زندگی

ماننا پڑتا ہے آخر کو یہ شوق
ہے بشر امیدوارِ زندگی

۱۹۳۷ء

ختم جس جا عقل کی پرواز ہے
وہ جنوں کا نقطۂ آغاز ہے

ہم ہیں اور دردِ دلِ ناساز ہے
دشمنِ جاں ہجر میں ہمراز ہے

لطفِ پیکاں لذتِ ناوک نہ پوچھ
تیری نظریں کہتی ہیں اعجاز ہے

خود ہوئے آ کر اسیرِ دامِ عشق
دشمنِ جاں قوتِ پرواز ہے

سازِ دل سے کس کی آتی ہے صدا
ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے

چھیڑ دے نغمہ کوئی سازِ جنوں
طائرِ دل زمزمہ پرداز ہے

کہتے کہتے آپ کیوں چپ ہو گئے
کیا کوئی اس میں بھی پنہاں راز ہے

ساقی و میخانہ و میکش نئے
اب کہاں وہ بادۂ شیراز ہے

دل کا شکوہ کس لیے کرتے ہو شوق
دشمنِ جاں ہمدم و دمساز ہے

۱۹۳۷ء

نہیں دھوکے میں آتے طرزِ دنیا دیکھنے والے
سمجھ جاتے ہیں منشا رنگِ چہرہ دیکھنے والے

پشیماں کچھ ہوئے ہیں حالِ شیدا دیکھنے والے
تماشا بن گئے خود ہی تماشا دیکھنے والے

جہاں رنگ و بو کی سیر کب تک نیچی نظروں سے
بہ چشمِ غور دیکھا اے رنگِ دنیا دیکھنے والے

فریبِ حسن اور یہ چشمِ ظاہر بیں قیامت ہے
اُٹھا کر دل کا پردہ دیکھ جلوہ دیکھنے والے

طلسمِ ہستیٔ موہوم حیرت کا مرقع ہے
بہ شکلِ آئینہ ہیں حیرت افزا دیکھنے والے

بنایا سجدہ گاہِ حسن ہم نے دیر و کعبہ کو
وہی جلوہ ہے دونوں جا اِدھر آ دیکھنے والے

کسی سودا زدہ کو چھیڑتا کیا ہے سرِ محفل
کہیں ہنگامہ ہو جائے نہ برپا دیکھنے والے

۱۹۳۷ء

عجب محفل تھی ہر اک بے خبر تھا سعیِ حاصل سے
مآلِ بزمِ ہستی پوچھتے کیا اہلِ محفل سے

خدا جانے رگِ جاں نے کہا کیا تیغِ قاتل سے
نہ کھُل جائے کہیں رازِ محبت رقصِ بسمل سے

وہی جذباتِ پنہاں ہیں وہی ہے شوق بیتابی
مقدر کی کشش رکھتی ہی مجھ کو دُور منزل سے
یہ مضراب محبت زخمہ زن تارِ نفس پر ہے
صدائے غم نواز آتی ہے سنو ٹوٹے ہوئے دل سے
یہاں پروا ہی کب تھی بند زنداں سے رہائی کی
بلا کا انس تھا آوازۂ شورِ سلاسل سے
ہجومِ یاس و حرماں آہِ سوزاں دردِ بے درماں
کہاں اتنی ہی اب وسعت کہ اُبھرے آرزو دل سے
خلش کیسی کہ احساس خلش تک بھی نہیں ہوتا
چبھے ہیں خارِ غم اتنے کہ جو نکلیں گے مشکل سے
نگہ نیچی۔ حیا دامن کشاں رُخ پہ ندامت ہی
عجب حیرت کا عالم ہے نمایاں روئے قاتل سے
وہ ساحل پہ پہنچکر اختلاط و جوش موجوں کا
پلٹنا ان کا وہ گھبرا کے پھر آغوشِ ساحل سے
قدم ڈگنے نہ پائیں شوق راہِ عشق میں اپنے
نہ گھبرانا کہیں دشواریٔ بارِ سلاسل سے

۱۹۳۸ء

کوئی تدبیر ایسی ہو شکستہ ساز بن جائے — اور اُس سے نکلے جو نغمہ مری آواز بن جائے

دلِ سودا زدہ بس ہوش میں آ بن سودائی — جنونِ شوق ساماں کا نہ نو آغاز بن جائے

وہ دل کس کام کا جو ایک حالت پر نہیں رہتا — کبھی غمگیں، کبھی نالاں کبھی ناساز بن جائے

اگر کچھ بھی اثر پیدا ہو آہ صبحگاہی میں — عجب کیا طائرِ دل کی یہ پرواز بن جائے

نہ ہے تاب و تواں دل میں نہ ہی صبر شکیبائی — سہارا ایک دم کا ہی وہی دمساز بن جائے

جنونِ عشق رہنے دے مجھے اب اپنی حالت پر — یہ کیسی بیخودی جو ہوش کا آغاز بن جائے

دعائیں بد ہیں ان کی اور ہیں گمنام دنیا میں — مزہ جب ہے کہ میرے حق میں وہ اعجاز بن جائے

پلا ساقی جو کچھ باقی بچی ہو شیشۂ و خم میں — کہ میری بیخودی خود میکدہ کا راز بن جائے

اسی کو شوق اہلِ دل فریبِ حسن کہتے ہیں
کہیں فتنہ کہیں شوخی کہیں انداز بن جائے

۱۹۳۸ء

وہ ہی اور شہرتِ یکتائی ہے — میں ہوں اور میری جبیں سائی ہے

کچھ نہ کہنا یہی دانائی ہے — شوق دیوانہ ہے سودائی ہے

درد بھی اب نہیں اٹھتا دل میں — کیا یہی صبر و شکیبائی ہے

آج تک حسرتِ دیدار لیے — آپ کا ایک تمنائی ہے

شوق میں مرتے ہیں مرنے والے — اور وہ محوِ خود آرائی ہے

مستی حسن ہی خود ہی عریاں حیرتی چشم تماشائی ہی
شوق وہ مجمعِ احباب کہاں
ہم ہیں اور گوشہ تنہائی ہی

۱۹۳۸ء

یہ خبر نہیں کہ قسمت مجھے لائی ہی کہاں سے
یہ ہی انقلابِ عالم کہ ہوں دُور آشیاں سے
تجھے کیا بتاؤں ہمدم یہ ہی ماجرائے اُلفت
نہ ہو جس کی انتہا کچھ کوئی کیا کہی زباں سے
چلے آئے ہیں بہک کر درِ میکدہ پہ ساقی
یہ نہ پوچھ میکشوں سے کہ تم آئے ہو کہاں سے
حدِ عشق کا تعین کری کوئی کیا سمجھ کر
اُسی حسن جانتا ہی ہوئی ابتدا جہاں سے
اُسے ڈھونڈتا ہوں اب تک جو ہی منزلِ حقیقت
میں ہوں بندۂ طریقت مجھے کیا غرض جہاں سے
کوئی حد ہی خامشی کی نہیں تابِ ضبط باقی
دلِ زار کی یہ بپتا سُنو دکھ بھری زباں سے

تمھیں شوق کیا ہوا ہی یہ تو بات ہی انوکھی
کبھی کوئی دل ہلا ہے کسی آہِ ناتواں سے

۱۹۳۸ء

کسی اسیرِ بلا کی یونہیں بسر ہو جائے
کہ روتے روتے کٹے رات اور سحر ہو جائے
نجانے بیخودیٔ عشق نے چلی ہے کدھر
جو گمرہی تھی وہی پھر نہ راہبر ہو جائے
پلادے آج تو اکِ مستِ لاابالی کو
وہ جامِ بادہ ہو جس سے کہ باخبر ہو جائے
تم اپنے طرزِ تغافل سے خود رہے مجبور
چلے بھی آؤ کہ قصہ ہی مختصر ہو جائے

کسی کی ترچھی نگاہوں کے ہم نہیں قائل نظر وہی ہے کہ جو دل میں رخنہ گر ہو جائے
ہمارا قصۂ غم درد سے نہیں خالی زباں کہاں سے وہ لائیں کہ پُر اثر ہو جائے

بشر کو چاہیئے ہر دم فروتنی اے شوق
اگر ہے شرم گنہ پا بہ گل شجر ہو جائے

۱۹۳۸ء

ہم نے مآلِ عشق پہ ڈالی نظر نہ تھی اس مبتدا کی کیا کہیں مطلق خبر نہ تھی
دل بجھ گیا تھا آہ کوئی پُر شرر نہ تھی ٹھنڈی یہ آگ کب ہوئی ہم کو خبر نہ تھی
کیا سخت منزلیں تھیں کسی سے نہ طے ہوئیں وہ وسعتِ جہاں تھی کہ حدِ نظر نہ تھی
سنتے تھے آہِ صبح میں ہوتا ہے کچھ اثر قسمت سے رات وہ ملی جس کی سحر نہ تھی
آرام سے پہونچ تو گئے رہروانِ عشق سنتے تھے جیسا راہِ عدم پر خطر نہ تھی
گرمیٔ عشق ہی نے تو پھونکے ہیں دو جہاں سلگی ہوئی یہ آگ بتاؤ کدھر نہ تھی

عالم کی دلفریبیاں کیا پوچھتے ہو شوق
لیکن نگاہِ شوق کسی کی اُدھر نہ تھی

۱۹۳۸ء

بہار لاجواب آئے نہ آئے امنگوں پر شباب آئے نہ آئے
بنیں گے ہم کلیم طور کچھ ہو ترے جلوے کی تاب آئے نہ آئے
تمناؤں کو لے کر ہم کریں کیا دلِ خانہ خراب آئے نہ آئے

یہ جتنے بیٹھے ہیں سب پارسا ہیں ذرا پوچھو شراب آئے نہ آئے

دکھاؤں دفترِ عصیاں میں کس کو سمجھ میں یہ حساب آئے نہ آئے

کہاں تک ذوقِ معصیت سے پرہیز کہ پھر لطفِ شباب آئے نہ آئے

پیامِ شوق ہے کچھ مختصر سا

خدا جانے جواب آئے نہ آئے

۱۹۳۸ء

مرے دل نے بھری محفل میں کھو دی آبرو میری
نظر آتی ہے کچھ سونی سی بزمِ آرزو میری

شبِ تاریک اور ذوقِ تصوّر اے معاذاللہ
قیامت خیز ہے فرقت میں کیا کیا ہائے ہو میری

قدم اوٹھا ہی شوقِ دید میں ذوقِ طلب میرا
حریمِ ناز تک پہونچے گی آخر جستجو میری

بہت نادم ہوا کہہ کے اپنے غمگساروں سے
سمجھتا ہی نہیں کوئی حدیثِ آرزو میری

مٹاتا جا رہا ہوں ، ہر قدم پر نقشِ پا اپنا
زمانے والو سن لو اب نہ کرنا جستجو میری

ابھی ہی ابتدائے قصۂ غم پوچھتے کیا ہو
سُنی جائے گی تم سے دُکھ بھری کیا گفتگو میری

مرے دم سے ہی وابستہ بہارِ ہستیٔ گلشن
فضائے دہر میں ہی رنگ میرا اور بو میری

تری نیرنگیاں سب دیکھ لیں اے ہستیٔ فانی
لیئے جا حسرتوں کو اب نہیں نیرا نہ تو میری

اسی کو انتہائے عشق کیا اے شوق کہتے ہیں
کہ مجھکو خود نہیں معلوم کیا ہے آرزو میری

۱۹۳۸ء

سوزشِ دل کے لیے کیا قسمتِ پروانہ ہے
اپنی ہستی سے جہاں میں آپ وہ بیگانہ ہے

ہے جدا سب سے ترے دیوانے کی دیوانگی
ہوش بیہوشی میں ہو جس کو وہی دیوانہ ہے

بزمِ رنداں میں تو ساقی کچھ حری شنتا نہیں
کس سے آخر میں کہوں خالی مرا پیمانہ ہے

دیکھ آ کر حسن کی رعنائیاں اے حیرتی
کثرتِ جلوہ اُدھر ہے جس طرف بتخانہ ہے

پوچھتے کیا ہو دلِ حسرت زدہ سے کیا ہوا
سُن چکے ہو بارہا جس کو وہی افسانہ ہے

اپنی ہستی پر بھروسہ کس لیے اے بوالہوس
دیکھ عبرت خیز عالم ہیں پہ پروانہ ہے

ہو مبارک اے حریصو ساغر و مینا تمہیں
یاں تو قسمت میں وہی ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

یاد رکھ اے رہروِ راہِ طریقت یاد رکھ
ہر قدم پر سر جھکانا سجدۂ شکرانہ ہے

نالہ و آہ و فغان و اشکِ خوں دردِ جگر
ہجر میں ایک ایک کا انداز بیتابانہ ہے

دستِ ساقی سے چھلکتا جام آخر لے لیا
آفریں صد آفریں کیا لغزشِ مستانہ ہے

عالمِ امکاں کو دیکھا عالمِ لاہوت دیکھ
شوق تیری جستجو کہتے ہیں بیباکانہ ہے

۱۹۳۹ء

عشق کا راز کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں امید کہ وہ حشر بہ داماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخلِ زنداں ہو جائے

درد قابو کا نہیں کاش وہ اوٹھ کر شبِ غم
سرگذشتِ دلِ ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلّی نہ دلاسا نہ کہیں نام کو صبر
حیف اُس دل پہ کہ یوں بے سروساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول۔ بڑھے جوشِ نمو
حسنِ پنہاں کسی عنواں سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاکِ گریباں ہو جائے

جتنے منظر ہیں وہ آجائیں سمٹ کر دل میں
وسعتِ سینہ اگر تا حدِ امکاں ہو جائے

رنگِ نیرنگیٔ عالم کا تماشا دیکھا
ایک بستی جو بسے شہرِ خموشاں ہو جائے

چشمِ تر نالۂ دل سوزِ دروں دردِ فراق
ایک مجبور کو کیا کیا سروساماں ہو جائے

عشقِ بیباک ہو اور شورشِ جذب کامل
کوئی مشکل نہیں ایسی جو نہ آساں ہو جائے
شوقِ مے نوش کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا
خُم میں جو دُرد بچے نذرِ حریفاں ہو جائے

۱۹۳۹ء

حُسن جب چشمِ سخنگو کا پتا دیتا ہے — عشق در پردہ ہمیں درسِ فنا دیتا ہے
درد اٹھ اٹھ کے محبت میں مزا دیتا ہے — دل میں بیٹھا ہوا یہ کون صدا دیتا ہے
کونسا نغمہ ہے جو دل کو ہنسا دیتا ہے — پردۂ ساز تو کچھ اور صدا دیتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہے کیا رازِ حیات — جو نفس آتا ہے پیغامِ فنا دیتا ہے
کچھ اثر ہو کہ نہ ہو یہ تو خدا ہی جانے — دل ہے مجبور کہ ظالم کو دعا دیتا ہے
دل کو ہمدرد تو کہتے ہو مگر غم کے سوا — اور کیا تم کو وہ اربابِ وفا دیتا ہے
گو ہے روشن نفسِ سوز سے ہستی کا چراغ — کون جھونکا ہے جو دم بھر میں بجھا دیتا ہے
سازِ حسرت کا عجب طرزِ نوا ہے کہ نہ پوچھ — قصۂ غم کو وہ ہر لے میں سُنا دیتا ہے
عشقِ جاں سوز بھی ہے سازِ جنوں کا پردہ — پردے پردے سے ہر اک راز بتا دیتا ہے

سوزِ الفت نظر آتا نہیں لیکن اے شوق
آگ جو بجھ نہ سکے دل میں لگا دیتا ہے

۱۹۳۹ء

ازل سے عشق کو درسِ بقا دیا ہیں نے
فنا کے رنگ میں جلوہ دکھا دیا ہیں نے

نظر سے پردہ دوئی کا اوٹھا دیا ہیں نے
طلسم جلوۂ رنگیں دکھا دیا ہیں نے

چمن میں جا کے گلوں کو ہنسا دیا ہیں نے
مآل ہستیٔ شبنم دکھا دیا ہیں نے

وفا پرستیٔ دل تھی بلائے جاں مجھ کو
مٹا دیا اُسے آخر مٹا دیا ہیں نے

نسیم صبح کو شکوہ ہو میرے نالوں سے
خموش غنچوں کو کیوں گدگدا دیا ہیں نے

حریف سوزِ دلِ زار شمع ہو نہ سکی
کہ شام ہوتے ہی اُس کو بجھا دیا ہیں نے

دلِ رمیدہ کی وہ گمرہی معاذ اللہ
نشانِ جادۂ منزل دکھا دیا ہیں نے

وفا کے نام سے توہینِ عشق ہوتی تھی
وہ ایک حرفِ غلط تھا مٹا دیا ہیں نے

وہ سادہ رنگ تھے کیا کرتے ایسے اشکوں کو
نظر سے اس لیے ان کو گرا دیا میں نے
کسی کا جلوہ گہہ ناز جب نظر آیا
سرِ نیاز وہیں پر جھکا دیا میں نے
نیازمندیِ حسرت زدہ نہ پوچھ اے شوق
حریمِ ناز کا پردہ اٹھا دیا میں نے

۱۹۳۹ء

ظلمت کدۂ دل میں تنویر نظر آئی
عالم کے مرقع کی تصویر نظر آئی
آہِ دلِ سوزاں کا آخر یہ نتیجہ تھا
جب خاک ہوا جل کر تاثیر نظر آئی
گلزار چھٹا ہم سے اور کنجِ قفس دیکھا
یہ خوابِ پریشاں کی تعبیر نظر آئی
دیوانہ کی وحشت نے پھر پاؤں ہیں پھیلائے
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
تو محو تھا سجدے میں ہم دیر میں جا پہنچے
واں شیخِ حرم ہم کو تصویر نظر آئی

منصور کے نعروں نے خود اُس کو کیا رسوا
نالوں میں مرے دل کے تکبیر نظر آئی

آہیں ہیں مرے لب پر آنکھوں میں بھری آنسو
دیکھو یہ مرے دل کی تفسیر نظر آئی

دیوانہ کی خاموشی اک راز تھا وحشت کا
آواز نہ تھی لیکن زنجیر نظر آئی

وہ کونسی صورت تھی کیا تجھسے کہیں اے دل
جس رخ سے اُسے دیکھا تصویر نظر آئی

کیوں آئے تھے ہستی سے اے شوق عدم ہی ہم
یاں آتے ہی قسمت کی تحریر نظر آئی

تمام شد

ضمیمہ

غزلیات جو بعد ترتیب دیوان لکھی گئیں

سنہ ۱۹۴۰ء

جہاں میں ترا بول بالا رہیگا
اگر ساقیا دور چلتا رہیگا

کوئی لاکھ دل سے بھلا دے مگر
مرے بعد میرا فسانہ رہیگا

اگر ہے یہی انقلاب زمانہ
مرا عشق پہلو بدلتا رہیگا

بقا میں فنا ہے فنا میں بقا ہے
یہہ دور تسلسل ہمیشہ رہیگا

نہ لٹ جائے دیکھو یہ دنیائے ہستی
فقیروں کا یونہیں جو پھیرا رہیگا

بجھائے سے بجھتی نہیں آگ دل کی
یہہ شعلہ بھی کب تک بھڑکتا رہیگا

جنوں نے اگر اور کچھ خاک چھانی
نہ دیوانہ کوئی نہ صحرا رہیگا

اگر خواب میں وہ نہ آئے تو پھر
کہو کس طرح دل بہلتا رہیگا

پتہ کس سے پوچھیں کہ منزل کہاں ہے
کہاں تک مسافر بھٹکتا رہیگا

ارے جاگنے والے دم بھر تو سو جا
کوئی تجھ کو کب تک تھپکتا رہیگا

وہ ساحل ہوا موج طوفاں ٹھہر جا
مجھے ڈوبنے کا سہارا رہیگا

عجب خار حسرت ہوا شوق دل میں
یہ کانٹا سا ہر دم کھٹکتا رہیگا

نہو شوق کی تم کو الفت بلا سے
زمانہ اوسے یاد کرتا رہیگا

سنہ ۱۹۴۰ء

بزم کی رونق گئی کچھ ایسی پروانے کے بعد
شمع بھی روئی سحر تک اُس کے جل جانے کے بعد

سوز و ساز عشق کب رہتا ہے پروانے کے بعد
دل جلوں کی یاد بڑھ جاتی ہے جل جانے کے بعد

تشنۂ دیدار ہی پھر اور جلوے کی نظر
چل کے دیکھیں اور آگے کیا ہے بتخانے کے بعد

دل اگر ہو مطمئن تو پھر کوئی مشکل نہیں
دور ہو جاتی ہے اولجھن خود سلجھ جانے کے بعد

اضطراب دل کی حالت ہمنشیں مجھ سے نہ پوچھ
اک نیا افسانہ چھڑ جاتا ہے افسانے کے بعد

ارتباطِ کثرت و وحدت جہاں آئے نظر
اور معبد کوئی ایسا بھی ہے بتخانے کے بعد

یوں تو لاکھوں آئے اور ناکام دنیا سے گئے
یاد دیوانہ مگر اب بھی ہے دیوانہ کے بعد

عشق میں ہوتی ہے ننگ و نام کی پروا کسے
راز دل چھپتا نہیں ہے دل کے آجانے کے بعد

توبہ کر توبہ نہ گھبرا زاہدِ دنیا پرست
تیری مسجد راہ میں پڑتی ہے میخانے کے بعد

ابتدا میں شوق کچھ سمجھے نہ ہم انجامِ عشق
کچھ سمجھ میں بات آئی خود ہی مٹ جانے کے بعد

سنہ ۱۹۴۰ء

وہ جلوے حسن کے ہم کو دکھائے جاتے ہیں
نگاہِ شوق ہم اپنی جھکائے جاتے ہیں

یہی سزا ہے کہ جل جائے اب دلِ پُرسوز
یہ شعلے بھڑکے ہوئے کیوں بجھائے جاتے ہیں

ازل سے حسن تو ہے بے نیازِ عشقِ مجاز
اُسی کے جلوے اک عالم پہ چھائے جاتے ہیں

سُنا ہے جب سے کہ رہبر نے ہار دی ہمت
الٰہی خیر! قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

یہ طرفہ بات ہے کچھ منہ سے بولتے ہی نہیں
نگاہیں چار ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں

نجانے کیا ہوئی پروانہ کی وہ خاکستر
ستم ہے سوختہ پر پھر جلائے جاتے ہیں

یہ مر مٹوں ہی نے مر کر بسائی ہے بستی
مٹے ہوؤں کے نشاں کیوں مٹائے جاتے ہیں

اُٹھا نہ دید کے متوالے دیکھ بھال کے آنکھ
حریمِ ناز کے پردے اُٹھائے جاتے ہیں

ابھی تو سونے دو اِن خفتگانِ عشق کو شوق
کریں نہ حشر بپا کیوں جگائے جاتے ہیں

۱۹۴۰ء

سازِ دل کی نے میں ہر نغمہ سُنا کرتا ہوں میں
پھر بھی کیا کیا نامکمل داستاں پاتا ہوں میں

یہ نہ پوچھو دل میں پنہاں اور کیا رکھتا ہوں میں
راز کہتے ہیں مجھے اور راز ہی رہتا ہوں میں

نالۂ دل لب تک آتا ہے تو گھبراتا ہوں میں
قصۂ غم اِک زبانِ نو میں کہہ جاتا ہوں میں

سازِ دل رکھتا ہوں ایسا جو ہے بے ساز و نوا
عشق کی دنیا میں رہ کر درد بن جاتا ہوں میں

جلوے لاکھوں ہیں مگر ہے تابِ نظارہ کسے
کیا کہوں خود بیخودی میں اپنی کھو جاتا ہوں میں

یاد جب آتی ہے دل کی سرگذشتِ زندگی
اپنی ہستی سے تصور میں گزر جاتا ہوں میں

دِل تو ہے مشتاقِ دیدِ جلوۂ حیرت نواز
کیوں حریمِ حُسن تک جا کر پلٹ آتا ہوں میں

ہے تلاطم خیز بحرِ عشق کیسا ہو امتیاز
دست و پا شل ہیں اُسی رَو میں بہا جاتا ہوں میں

کیا سکونِ دل کا چارہ شوق دُنیا میں نہیں
عمبر کو بے صبر اپنے سے سوا پاتا ہوں میں

سنہ ۱۹۴۰ء

ہم بھی اے دستِ جنوں کارنمایاں کرلیں — پُرزے دامن کے کریں ٹکڑے گریباں کرلیں
داغِ دل داغِ جگر سب ہیں اُبھرنے والے — کونسا داغ ہے ایسا جسے پنہاں کرلیں
میکدے اُجڑے ہیں اگلے سے وہ مینوش کہاں — ٹھہرو کچھ دیر کہ ہم یادِ حریفاں کرلیں
آمدِ فصلِ بہاراں کی مچی ہے اک دھوم — آؤ دیوانو کہ کچھ تو سروساماں کرلیں
کون ہوتا ہے نمکپاشِ جراحت ہمدم — پہلے ہر زخم کو آسودۂ درماں کرلیں
حُسن خودبیں کے مقابل رہے دل کی حیرت — آئینہ گر کو اس آئینہ میں حیراں کرلیں
ذکرِ دلدار کجا اور کجا مستِ الست — ایسی کیا یاد جسے مائلِ نسیاں کرلیں
رحمتِ حق کے طلبگار ہیں ہمسے لاکھوں — پہلے خود بھی تو کچھ اندازۂ عصیاں کرلیں
دل ہے محرومِ ازل چارہ گری اور نہیں — ایسے ناکام کو شائستۂ حرماں کرلیں

ذوقِ نظارہ کا اے شوق تقاضا ہے یہی
رازِ الفت جو نہاں ہے اُسے عریاں کرلیں

سنہ ۱۹۴۰ء

یادِ ہو حق جو دلائی ترے دیوانے کو — ایسا بہکا کہ چلا بھول کے میخانے کو
ترکِ شورش کی نصیحت ارے دیوانے کو — مان لے کیسے وہ ناصح! ترے سمجھانے کو

ساقیا تجھسے یہ کہ دیتے ہیں مستانِ ازل
منہ لگائیں گے نہ ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

صبح ہوتی ہی ہوئی ختم جو بزمِ انجم
مژدۂ وصل دیا شمع نے پروانے کو

دیکھو دیکھو دلِ شوریدہ کی ضد کی باتیں
پھر لیئے جاتا ہی ظالم مجھے تہخانے کو

جب ملی جام ہی پھٹ ہی ملی ای ساقی
بارہا دیکھ چکے ہم تری میخانے کو

لاکھ بہکاؤ اُسے اب وہ بہکنے کا نہیں
آشنا راز سے کس نے کیا بیگانے کو

دستِ ساقی میں چھلکتے ہوئے دیکھا جو اُسے
ہاتھ سے جانے دیا ہم نے نہ پیمانے کو

اب نہ شورش ہی وہ دل میں نہ وہ سر میں سودا
جانے کیا کہدیا دیوانے نے دیوانے کو

گرمیٔ عشق نے دونوں کو نہ رکھا محروم
شمع کو سوز دیا غم دیا پروانے کو

سحر سے کم نہ تھی تیری وہ لگاوٹ کی نظر
کیسا دیوانہ کیا شوقؔ سے فرزانے کو

سنہ ۱۹۴۰ء

جلووں سے عالم میں حیرت ہو گئی
کیا کہوں وحدت میں کثرت ہو گئی!

لنترانی نے دیا کچھ بھی نہ ساتھ
صفت میں کیسی ندامت ہو گئی

رات دن کہتے ہیں کہتے ہائے دل
دل کا دینا اک مصیبت ہو گئی

حسن کی ہنگامہ آرائی نہ پوچھ
اک قیامت سی قیامت ہو گئی

تجھ سے کب تھی مجھ کو امیدِ وفا
ہو گئی اسے بے مروت ہو گئی!

خامشی سے کام ہم نے کیوں لیا
یہ بھی گویا اک شکایت ہو گئی

جلوہ گر تھیں حسن کی رعنائیاں بند کیوں چشم حقیقت ہو گئی

دیدیا تاب و تواں نے جب جواب کارفرما دل کی وحشت ہو گئی

کیوں بُلاتے ہم اگر یہہ جانتے ان کا آنا اک قیامت ہو گئی

دم بخود شہر خموشاں میں تھے سب دیکھنے والوں کو عبرت ہو گئی

کس قدر دلچسپ تھی روداد شوق

سارے عالم میں کہاوت ہو گئی!

سنہ ۱۹۴۰ء

تصور میں تری تصویر پہچانی نہیں جاتی

نہیں جاتی دلِ حیراں کی حیرانی نہیں جاتی

اِدہر مجبور ہم۔ غم کی فراوانی نہیں جاتی

اودھر دل کی بھی وہ آشفتہ سامانی نہیں جاتی

نہین بجھتی لگی دل کی نہیں بجھتی لگی دل کی

نہیں جاتی یہہ دل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

عجب ہے شمعِ بزمِ ناز اندازِ حیا تیرا

یہہ کیا! فانوس میں بھی رہ کے عریانی نہیں جاتی

لباس نو بھی پہنا کر تری دیوانے کو دیکھا

مگر جوشِ جنوں میں چاک دامانی نہیں جاتی

نجانے کیا صبا سے ہو گئی تھی ایسی گستاخی
ابھی تک گیسوؤں کی وہ پریشانی نہیں جاتی

شب فرقت ہیں تنگ آ کر دعائیں مانگنی چھوڑیں
نہیں جاتی مگر یہ غم کی دیوانی نہیں جاتی

کسی کے نغمۂ پرکیف سے مستی وہ چھائی ہے
چمن کو چھوڑ کر اب طبع وجدانی نہیں جاتی

یہ ہے امید کس کو ان کے آنے کی مگر اے شوق
مری مشقِ تصور کی وہ جولانی نہیں جاتی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
محمد احمید الدین پرنٹر و پبلشر

ضمیمۂ ثانی

"ہمہ اوست"

غمگسارِ ما توئی و چارہ سازِ ما توئی   دلفگارِ ما توئی و دلنوازِ ما توئی
آستانِ ما توئی و بے نیازِ ما توئی   آسمانِ ما توئی و سرفرازِ ما توئی
مہربانِ ما توئی و دلگدازِ ما توئی   تکیہ گاہِ ما توئی و کارسازِ ما توئی
عیب پوشِ ما توئی و پردہ دارِ ما توئی   کردگارِ ما توئی و تاجدارِ ما توئی
بادۂ وحدت توئی و ساغر و مینا توئی   ساقیِ کوثر توئی و کیف و صہبا توئی
خندۂ ساغر توئی و دورِ پیمانہ توئی   رندِ مستانہ توئی و پیرِ میخانہ توئی
نالۂ غمگیں توئی و لذتِ ہجراں توئی   دردِ مہجوراں توئی و نازِ معشوقاں توئی
شمعِ بزمِ ما توئی و سوزِ پروانہ توئی   رونقِ محفل توئی و نورہ شانہ توئی
جوہرِ خنجر توئی و رقصِ دربسمل توئی   اشتیاقِ دل توئی و جذبۂ کامل توئی
اضطرابِ دل توئی و ہوشِ فرزانہ توئی   جذبِ مجذوباں توئی و جوشِ دیوانہ توئی
بلبلِ نالاں توئی و قمریِ شیدا توئی   رنگ و بوئے گل توئی و قلقلِ مینا توئی
شورِ ناقوسی توئی و بانگِ ملّانہ توئی   زینتِ کعبہ توئی و زیبِ بتخانہ توئی
سبزۂ گلشن توئی و غنچۂ خنداں توئی   سروِ بستانی توئی و سنبلِ پیچاں توئی

عشوهٔ دلبر توئی و فتنهٔ دوراں توئی　　نورِ چشمِ وا توئی و نرگسِ حیراں توئی

نغمهٔ دلکش توئی و نالهٔ مضطر توئی　　شافعِ عاصی توئی و داورِ محشر توئی

حسنِ روز افزوں توئی و چہرهٔ زیبا توئی　　شوقِ نظاره توئی و دیدهٔ بینا توئی

چشمهٔ رحمت توئی و پاسدارِ دل توئی

شوق را شافع توئی و رہبرِ کامل توئی

رام کردم آں بتِ گلفام را　　مژدهٔ شادی دلِ ناکام را

از خُمِ می جرعهٔ ما را بس است　　ما نمی خواہم سبو و جام را

روزگارم شد بسر در رنج و غم　　تا بکے نالم غمِ ایام را

چوں شدم رسوائے الفت ناصحا　　دور کردم پاسِ ننگ و نام را

سادگیِ ساقیِ ما داں ببیں　　آب میگوید مے گلفام را

یک دلِ دیوانه دارم در بغل　　باز میخوانی چرا بدنام را

قیدیِ گیسوئے پیچاں شد دلم　　کو رہاند ایں اسیرِ دام را

بیخودی از ما ربوده عقل و ہوش　　ما نمیدانیم ننگ و نام را

شوق را دیوانه میگوید جہاں

شہرتے حاصل شده بدنام را

ترجمۂ قطعۂ فارسی

بلبل نہیں ہوں نالہ کروں دردِ سر بھی لوں
قمری نہیں ہوں طوق جو پہنے رہا کروں!
پروانہ میں نہیں ہوں عدم کو جو چل بسوں
میں شمع ہوں کہ اُف نہ کروں اور جل بجھوں

ترجمہ چند رباعیات عمر خیام

آب و گل سے اس کی قدرت نے مجھے پیدا کیا
اور اُس کے ساتھ سارا غم زمانے کا دیا
حضرتِ واعظ کو کیوں اصرار ترکِ مَے پہ ہے
خود مرا دستِ تہی لو باعثِ تقویٰ ہوا

دیگر

ان حسینانِ جہاں پر جو وہ شیدا ہوگا — دلِ شوریدہ یوہیں دیکھنا رسوا ہوگا
عشقِ کاکل کی ہوا سر میں ہی پانہ رہے — جب ہوئے مست تو بیکار یہ سودا ہوگا

دیگر

کب دھواں سوزِ نہاں سے مرے اُٹھتے دیکھا
ایک کم مایہ کو کب پھولتے پھلتے دیکھا
لوگ ناحق مجھے کہتے ہیں خرا باتی ہے
کس خرابات سے ہے مجھکو نکلتے دیکھا

دیگر

اُس بت نے کہا مجھ سے بتا اے مرے عابد!
کیوں سارا زمانہ ہے یہہ میرا ساجد
ہر سمت یہہ میری تجلی کا سماں ہے
آ تو بھی ادھر اور ہو اُس کا شاہد

دیگر

صبح دم آئی نِدا یہہ کسی مے خانے سے
"ہوش میں آ!" کوئی کہدے مرے دیوانے سے
آنکھ اب کھول۔ تو اک جام صبوحی ڈھل جائے
جوش میں مے ہے چھلک جائے نہ پیمانہ سے

دیگر

مے چھوڑ دی تو طعنہ نہ مستوں کو دیجیے
ہمّت اگر ہے - آج سے توبہ بھی کیجیے

اس پر ہے ناز آپ کو میخوار ہم نہیں
ہاں بات جب ہے مے کی غلامی نہ کیجیے

دیگر

مے قوّت جسم و قوتِ جاں ہے میری
مے کاشفِ اسرار نہاں ہے میری
عقبےٰ سے غرض مجھکو نہیں ای ناصح
مے راہبرِ ہر دو جہاں ہے میری

دیگر

اگر قسمت میں گل ملنا نہو تو خار کافی ہے
ضیائے نور کے بدلے مجھے بس نار کافی ہے
کسے تسبیح و سجادہ دکھائیں پارسا بن کر
ہمیں تو میکدہ - ناقوس اور زنّار کافی ہے

تہنیت نوروز

گل کھلائیگا چمن میں یہ سحاب نوروز
خوب برسیگی زمانہ میں شراب نوروز

سچ تو یہ ہی کہ نہیں آج جواب نوروز
کس قدر جامہ سے باہر ہی شباب نوروز

غنچے چٹکے تو اُٹھا پھولوں کے چہروں سے نقاب
ٹنی واللہ ہی کوئی دم میں حجاب نوروز

فصل گل دیکھتے ہی کھل گئے ابواب چمن
غنچے پڑھتے ہیں گلستاں میں کتاب نوروز

ذرّہ صحرا کا ہر اک رشک دہِ انجم ہی
دیکھ لے پیر فلک رنگ شباب نوروز

گردش لیل و نہار ایک کرشمہ اُس کا
شب۔ نقاب اس کی ہی اور دن ہی حجاب نوروز

عالم وجد میں ہر شاخ شجر جھومتی ہے
رنگ لایا ہی گلستاں میں شباب نوروز

تجھکو معلوم ہو کیفیت جذب پنہاں
چھیڑ کر دیکھ ذرا تار رباب نوروز

طالب دید تری ہوش کی پھر خیر نہیں
اوڑ گیا گر کہیں شوخی سے نقاب نوروز

فرحت افزا وہ فضائے چمن دہر ہوئی
چشم بد دور ذرا دیکھ شباب نوروز

دختر رز نہ ہی کہ شیشے میں پری اتری ہی
رنگ دکھلاتا ہی مینا میں شباب نوروز

نقش تقویم ہی سب پیش نظر ای حیرت
کہ یہہ تعبیر ہی آئینہ خواب نوروز

اپنے مستوں کو چھکا دے تہ عید ساقی
تا ابد شوق رہے دور شراب نوروز

تہنیت نوروز

اے شوق پھر آیا موسم گل — ہر شاخ ہے محوِ ناز بلبل!
قمری، بلبل جو نغمہ زن ہیں — ارباب طرب چمن چمن ہیں!!
نکھرا نکھرا ہے رنگ گلشن — اُبھرا اُبھرا گلوں کا جوبن
فرش سبزہ ہے ایسا ہموار — جو نقش قدم کو چُومے ہر بار
پڑتی ہیں شعاعیں جب کہ اُس پر — شبنم سے ہی کھلتا اُن کا جوہر
شہنائی صبا کی بج رہی ہے — مسند پھولوں کی سج رہی ہے
سبزے سے زمین سب ہی کاہی — لگ جائے نظر نہ یا الٰہی
ہے جلوہ فروش شاہدِ گل — ہے محوِ نشاط عیش بلبل
شبنم کے لگے جو قطرے بہنے — آبی جوڑے گلوں نے پہنے
ہیں بلبل و گل میں یہ اشارے — اب خوب کرو بہم نظارے
گلشن میں آج جشن نوروز — ہے بُرجِ حمل میں چہرہ افروز
عالم میں ہے رات دن برابر — ذرّے ہیں چمن کے رشکِ اختر
غنچوں کی چٹک ہے خندہ گل — اوڑتا ہی چمن میں ساغر مل
ساقی وہ شراب ارغوانی — ہو جس سے شفق کا رنگ پانی

ہونٹوں سی لگا دے اُس کا اک جام
دل سی تا دُور ہوں سب آلام

نوروز ہے اِک غزل کہو شوق
ہو سب کے کلام پر تمھیں فوق

غزل نوروز

دلکش ستھرا کلام نوروز
لو آؤ سنو پیام نوروز

ملتا ہر دم ہے لطف تازہ
کیسا پیارا ہے نام نوروز

خوبانِ جہاں ہیں زینت بزم
گردش میں اب آئے جام نوروز

سارا گلشن ہے رشک رضواں
کیا خوب ہے فیضِ عام نوروز

آ بیٹھی چہکنے شاخِ گل پر
بلبل نے سُنا جو نام نوروز

ساغر کو سنبھالے رہنا ای شوق
لغزش ہے لیئے خرام نوروز

ہل چل سی مچی ہے اک جہاں میں
کیا جانے ہو کیا نظام نوروز

ناچیز اگرچہ ہے بظاہر
تحفہ ہے مرا اسلام نوروز

ای شوق یہاں میں ہم بھی مجبور
دنیا میں نہیں قیام نوروز

this *Diwan.* Mr. Raina's work shows a command of vocabulary, a familiarity with the poetic material of Urdu, a poetic attitude and temperament, a melancholy pensiveness and a quest of the ultimate secret of life which will ensure for his work a high place among contemporary writers in the traditional manner. One verse more with which to conclude this cursory note:—

'Umr akhir hui, woh josh-e-jawani na raha,
Yad aya bhi to kis waqt Khuda yad aya.

May 29, 1940. AMAR NATH JHA..

———————

11—Isi ko intahaye ishq kya, ai Shauq, kahte hain ?
Ki mujh ko khud nahin ma'alum kya hai arzoo meri.

12—Apni hi khabar nahin hai ham ko,
Bekar kisi ki justojoo hai.

13—Ilaj-e-dard-e-jigar, charasaz, rahne de !
Maza isi men hai, soz-o-gudaz, rahne de !

14—Yih kise ma'alum manzil tak woh pahunche ya nahin,
Ja bajaj ham to nishan-e-raftagan dekha kiye.

15—Na puchhe koi yih hamse, milega kya hamin ismen,
Ki naqshe Hasti ko khud ham mitaye jate hain.

Jise ho dekhna-aye woh dekh le manzar,
Hayat-o-maut ke jhagre chukai jate hain.

16—Bichhre hain kab se qafila-e-raftagan se ham,
Mil jaenge kabhi na kabhi karavan se ham.

17—Pata kis se puchhen ki manzil kahan hai ?
Kahan tak musafir bhatakta rahega ?

18—Kuchh batate hi nahin shahare khamoshan wale,
Kyon pasand unko yih ujra adamabad aya.

19—Ab uski justojoo kya hai ? na jane woh kahan pahuncha ?
Nishan-e-karkvkn manzil ba mknzil deahne wale.

The pieces that I have culled will amply indicate the wealth of poetry contained in

trend of Mr. Raina's thought. Vanity of vanities. This is specially the trend of his latest poetry.

1—Rahat-e-zeest yehi dard ka hasil hai yehi,
Rote rote gham-e-furqat men fana ho jana.

2—Naqsh-e-hasti mita raha hai koi,
Par mitana nazar nahin ata.

3—Dhoondne par bhi nishan milta nahin,
Mar miton ki shan-e-ghurbat dekhna.

4—Batayen kya ki aye hain kahan se ham kahan ho kar ?
Nishan ab dhoondte phirte hain ghar ka benishan ho kar ?

5—Sab puchhte hain shahr-e-khamoshan men, 'Kaun ho' ?
Hairan hain kya batayen musafir kahan ke hain ?

6—Na puchho hamsafiiran-e-chaman, main kaun, hun, kya hun,
Gharaz jo kuchh hun ik saz-e-shakista ki sada main hun.

7—Raha jab muddaton dair-o-haram men,
Samajh ayi ki bahkaya gaya hoon.

8—Mulk-e-adam ko qafile jate hain rat din,
Zahir magar kisi ka nishan-e-qadam nahin.

9—Aye hain kis muqam se, jate hain dekhiye kidhar,
Kis ne kiya hai ab talab, is ki bhi kuchh khabar nahin.

10—Rasta to udhar ka punchh lete,
Ai mulk-e-adam ke jane walo !

3—Butkada chhorne wale to na the,
Khair, milti hai to jannat hi sahi.

4—Butparasti men jis ki 'umr kati,
Aise kafir ka nam! are tauba.

5—Hashr men ham bhi zaban kholenge,
Bekason ki wahan sunwayi hai.

6—Khud hue akar aseer-e-dami-ishq,
Dushmane jan quwwat-e-parwaz hai.

As one reads through Mr. Raina's poems one realises that in spite of the veneer of Persian culture and underneath all the brilliant wit and gaiety that strikes one so prominently on meeting him, the inheritance of the Hindu asserts itself and philosophy keeps peeping in. He is puzzled, as what thinker is not, by the problem of life and the Great beyond. Is it life after life or a blank nothingness? Does the caravan travel on and on endlessly, or is there a goal where all must pause? Is there rest after long travail? Who is the guide? Does he know the path? Is there one path only? Do the footsteps of those who have gone ahead help at all? Pain and suffering and the aches of life, disillusionment, this is the stuff of which life is made. That seems to be the general

9—Jo tujhko kahna ho kahde woh sab isharon men,
Samajh men kuchh nahin ati tiri zaban, saiyyad.

10—Zara ji bhar ke us ko dekh leta main dame akhir,
Nazar ata qafas se kash apna ashiyan mujhko.

11—Unki bazme naz men royi, agar,
Shama mahfil se nikali jaegi.

12—Banaya sijdagah-e-husn ham ne dair-o-Ka'abe ko,
Wohi jalwa hai donon ja, idhar a, dekhne wale !

13—Kisi ka jalwa gahe na'z jab nazar aya,
Sare-niyaz wahin par jhuka diya main ne.

14—Rah rah ke puchhte hain yahi baghban se ham,
"Lejayen char tinke kahan ashiyan se ham ?"

Those who know Mr. Raina are aware of his wit and his zest for life. He has lived a full life and his journey through it has been agreeable. He can afford therefore to smile and laugh and jest. There are moods of play-fulness in his work. It is not the laugh of one who laughs that he may not weep, but of one who sees the light and bright side of life.

1—Woh daure badaye rangin, woh dilfareb nazar,
Khuda hi hai jo mujhe pakbaz rahne de.

2—Jate Ka'abai men but-parasti ko,
Yih bhi ik farz tha, ada karte.

and also to the sentiment of love, one can easily sympathise with the poet and realise how little scope he has for originality and short or long swallow flights of fancy. The surprise is that, this handicap not-withstanding, the ghazal is still so perennially fresh and charming. Conventional symbols are used plentifully by Mr. Raina and yet he has succeeded in making his verse attractive.

1—"Dair ko ao, chalen, ek thikana hai wohi,
Mil hi jaega wahin koi to rahbar apna.

2—Sholaye shama ne uth uth ke jalaya akhir,
Shauq, yih hashr hua bazm men parwane ka.

3—Aye hain taraste hue maykhane men Saqi,
Bhar de tu hi tuta hua paimana hamara.

4—Butkada chhorte to chhor diya,
Ab thikana nazar nahin ata.

5—Ham dhoondne gaye to sanam-khana mil gaya,
Tujh ko talash se bhi, na waiz, Khuda mila.

6—Kaisa butkhana, kahan ka dair, kaisi khanqah !
Jis jagah sijda kiya hamne woh Ka'aba ho gaya.

7—Guzra jo koh-e-tur par, malum hai woh sab,
Shayaq hun phir bhi jalwaye barqe jamal ka.

8—Main dekhte hi shishe men lalcha ke pi gaya,
Zahid bhi tark-e-mai ki qasam kha ke pi gaya.

4—Rafta, rafta, ta dare-i-janan,
baithte, uthte, yun pahuuche,
Thokaren khate, girte, parte,
subah se ta sham chale.

5—Khun shuda dil ko jalate hain jalane wale,
Ag pani men lagate hain lagane wale.

6—Yas-o-hirman-o-tamanna,
hasrato-ranj-o-alam,
Shauq se suniye ki sab kuchh
dil ke afsane men hai.

7—Kis qadar dilchasp thi rudad-e-Shauq,
Sare alam men kahawat ho gayi.

There are naturally a good many verses where the thought is conventional. That cannot be helped by any one who writes where one is bound by the rhyme arrangement in the ghazal's scanty plot of ground, and with each verse having to follow the law both of the radeef. and qafiya, it is inevitable that one should fall back upon the images and thoughts conjured up by certain words. If one is forced to confine oneself to words like "museebat", "qayamat', "shikayat", "haqiqat" "ibrat", "kasrat", "tabeeyat",

But even as early as 1889 one can hear the accent of to-day, as in the verse:—

Hai safar dur ka, aur sath men
hamdam bhi nahin.

Tujhsa, ai Shauq, koi be sarosaman
bhi na ho.

I have said above that Minai's influence can be seen in Mr. Raina's language. In several lines the charm is due to the elegance of expression, and to the command over idiom.

1—Pare hain mast matwale,
na kahate hain, na sunte hain,
Nayi basti, naya alam hai
yih shahare khamoshan ka.

2—Khudai ka hai dawa,
in buton ko, dekhiye kya ho
Udhar bhi ek sajda, ao,
bahre imtihan kar len.

3—Kuja but khana-o-Kaaba !
Kuja khum khana-o-saqi !
Kahan se, Shauq, shauq-i-deed laya
hai kahan mujh ko.

and problems that seem to have occupied the poet's mind and produced some of his best verses But first let us see how in his earliest work he has reproduced the note of maudlin sentimentality and the pretty, almost petty, conceits that one associates with the school of Amir Minai: –

(1) Mujhe gar qatl karte ho,
to jhagra hi mita dena,

Rahe baqi na abki bar, pyare,
kuchh kasar, dekho.

(2) Lakh tum rutho, manayenge
na ham bhi hargiz,

Tum hamen jan gaye,
ham tumhen pahchan gaye.

Here is a verse in the style of the later Lucknow school of writers:—

Giraya buton ne bhi nazron se dil ko,
Na rakhha kahin ab lagane ke qabil.

And here another:—

Tumhari adayen salamat rahen,
Qaza ko qaza agayi agayi.

effeminate, rejoicing in fineries and fopperies and polish and glitter, maudlin sentimentality, verbal tricks, and retaining none of the vigour and freshness and open acceptance of new impression and experiences that had characterised the earlier writers of Urdu. While Amir Minai's influence circumscribed young Jagmohannath's range of interests and limited his intellectual horizon, it was responsible for creating in him a keenness for correctness and exactness in the use of language. To this day one can notice in his verses traces of Amir's influence in the care with which he chooses his words and coins his phrases. But he has out grown the manner in which he wrote his earliest verses, and one may see a distinct individuality in his later work.

Mr. Raina began his poetic career as long ago as 1885, and is still writing in the year 1940. It is not surprising that during this period of over half a century his style should have developed and changed and his thoughts and views become maturer. But it is possible to find a consistency of outlook all through and the recurrence of some questions

among us appeals to a Muslim as to final arbiter in the matter of usage and idiom.

Urdu poetry as written by a Hindu, even under the guidance of a Muslim *ustad*, remains a literary *tour de force*. Subject to this reservation, praise must be given to many Hindus who have attained proficiency in the use of the Urdu language, of the metres, none of which has any similarity with indigenous Indian metres and all of which are governed by laws that are foreign, of the religious and literary traditions all of which are strange to them.

Pandit Jagmohan Nath Raina is a Kashmiri Brahman and like many others of his community belongs to a family that was associated with the Muslim Court and the law-courts the language of which was Persian. He was thus brought up in an exotic tradition and he turned to Urdu for literary expression, even as many young men brought up under the system of Anglo-Indian education turn to English. He came under the influence of Amir Minai, who may without offence be described as representing the decadent period of the Lucknow school of poetry-stilted,

and his gods a '*but*,' how constantly he has referred to Laila and Majnun, Shirin and Farhad, Yusuf and Zuleikha, and not to Nala and Damayanti, Savitri and Satyavan; how he has called upon Khuda, and spoken of Isa and Musa, and alluded to Mansur and 'Analhaq', and never of the names familiar to him from his cradle. It is surprising how completely absorbed the Hindu writer of Urdu seems in all the symbols and images that are so foreign to him – wine and repentance and the tavern, the rose and the nightingale, the graveyard and the Day of Judgment, the vision of Moses - and how ignorant he seems of the literary traditions of his own land - the bees and flowers, the lotus and the lily, the cuckoo and the *papeeha*, the mango-blossom, the numerous associations of the rainy season. My considered opinion is that much of the work of the Hindus in Urdu belongs not to literature but to literary curiosities, for no writer ever attained real emminence in a language the very genius of which is foreign to him. I do not forget names that will readily occur to any one; but I still maintain that Hindus do not speak or write Urdu 'as to the manner born', and even the tallest

PANDIT JAGMOHAN NATH RAINA, 'SHAUQ'.

Quite a number of Hindus, nourished on Hindu legends and traditions, still professing their ancestral faith, used to write Urdu and acquired a fair measure of proficiency in the use of a literature that, in its formal aspects, was a faint imitation of a foreign literature and that derived all its spiritual nourishment from Persia and Arabia. Hundreds of Hindus specially Kashmiris, Khattris, and Kayasths dwelling in cities and connected with the administrative machinery of the country, spent wearisome days and nights in producing ghazals, masnawis, nazms, even marsiyas, and yet not one of them was able to attain the rank of an acknowledged master. Even to this day, in histories of Urdu Literature, not one Hindu is to be found in the list of the recognised makers of Urdu. Grudgingly, a word of appreciation is thrown at the efforts of Naseem or Chakbast or Sarshar. But imagine just three names in the second or third rank in a period of over two and a half centuries. The truth of course is that Urdu never came anywhere near the spirit of India and always remained alien to the Indian genius. It has ever been a marvel how glibly a Hindu has described himself as a '*kafir*'

FOREWORD

By

PANDIT AMAR NATH JHA. M. A.,

Vice Chancellor of the Allahabad University.